طلوع اسلام

جنوری ۱۹۵۲

-/10/-

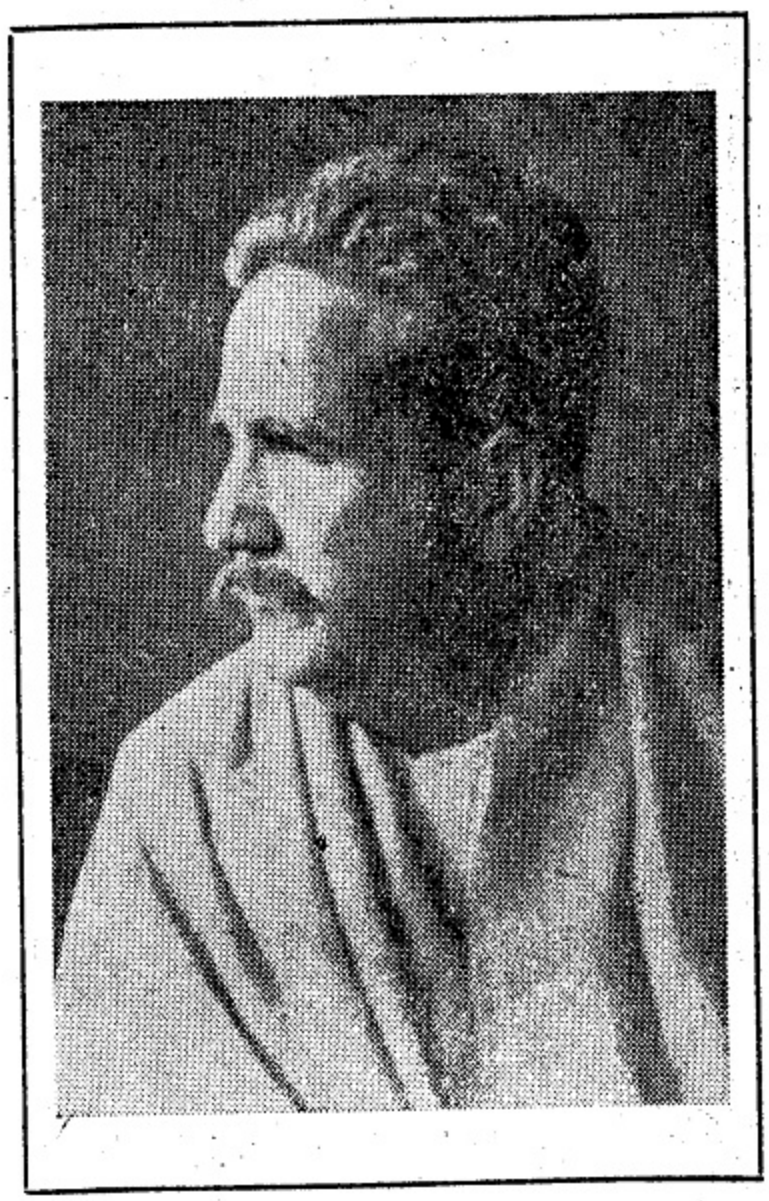

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا ہے جب، آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجیے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھیے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری سامان ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم لٹھا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ کراچی

اور پرچون کیلئے — الفنسٹن سٹریٹ کراچی

تشریف لائیے

نیاز آگیں: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدلِ اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		" غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۵	جنوری ۱۹۵۲ء	نمبر ۱

فہرستِ مضامین

سالِ نو	۴ — ۸	شیعہ (علامہ اسلم جیراجپوری صاحب)	۴۲ — ۵۱
لمعات	۹ — ۱۴	مسلم لیگ کی سیاست	۵۲ - ۶۰
رحمۃ اللعالمینؐ (محترم پرویز صاحب)	۱۵ — ۱۸	باب المراسلات	۶۱ - ۶۵
ملا کا بہشت	۱۹ - ۳۲	اے رحمۃ اللعالمین (نظم) (اسد ملتانی صاحب)	۶۶ - ۶۷
اسلام کا نظامِ سیاست (جناب ہارون خاں شروانی صاحب)	۳۳ - ۴۰	اشتہارات	۶۸ - ۷۲

باسمہٖ تعالیٰ

سالِ نو

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

اشاعتِ زیرِ نظر سے طلوعِ اسلام کی (نشأۃِ ثانیہ کی) عمر کا پانچواں سال شروع ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے دورِ اول کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو اس نے اب اپنی زندگی کے نویں سال میں قدم رکھا ہے۔ تجربے نے بتایا ہے کہ اس کی زندگی کا چوتھا سال اس پر کچھ "بھاری" ہوتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ یہ اس کٹھن منزل سے آگے نکل آیا ہے اور اب امید ہے کہ بتوفیق ایزدی، یہ آگے ہی آگے بڑھتا جائے گا۔ ھی حتی مطلع الفجر۔

جیسا کہ قارئین نے خود محسوس کر لیا ہوگا، طلوعِ اسلام (بقول علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ) ایک علمی کھیل نہیں بلکہ ایک نہایت اہم تحریک کا نقیب ہے۔ وہ تحریک ہے اس دین (نظامِ زندگی) کا دوبارہ احیاء جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو ملا اور جو آج قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ دنیا نے شاید اس سے زیادہ ستم ظریفی کبھی نہ دیکھی ہوگی کہ ہر مسلمان (جاہل اور "عالم") اقرار کرتا ہے کہ قرآن پر اس کا ایمان ہے اور یہی اس کے لئے نورِ ہدایت ہے۔ لیکن جب اسے قرآن کے مطابق نظامِ زندگی کے قیام کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو یہی مسلمان ("عالم" اور جاہل ـــــ سب سے پہلے "عالم" اور ان کی دیکھا دیکھی بچارا جاہل) اس آواز کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ یہ مخالفت سب سے زیادہ اس طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے جسے "علمائے کرام" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وہ عوام کو اُکساتے ہیں کہ شور مچاؤ تاکہ قرآن کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑنے پائے ـــــ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے ؟ قرآن نے کفار کے متعلق کہا تھا کہ وہ اپنے متبعین کو تاکید کیا کرتے تھے کہ لاتسمعوا لھذا القراٰن والغوا فیہ لعلکم تغلبون (۴۱/۲۶) کہ تم اس صورت میں کامیاب ہو سکتے ہو کہ تم خود بھی اس قرآن کو کبھی نہ سنو اور اس قدر شور مچاؤ کہ کوئی اور بھی اسے سننے نہ پائے۔ حیرت ہے کہ اللہ نے جو مسلک کفار کا بتایا تھا اسے خود مسلمان (اور عوام نہیں بلکہ ان کے اکابر) اختیار کر رہے ہیں۔ طلوعِ اسلام قرآن کی دعوت کا نقیب ہے اس لئے اس کی مخالفت غیر متوقع نہیں۔ ہر طرف سے شور مچایا جا رہا ہے کہ اس کی آواز نہ خود سنو نہ کسی کو سننے دو۔ لعلکم تغلبون۔ "شور مچانے" کی تلقین اس لئے کی جاتی ہے کہ ان کے پاس طلوعِ اسلام کے قرآنی دلائل کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہی نہیں۔ اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے کہدیا ہے کہ جو شخص قرآن کے خلاف دلیل لانا چاہے اسے سن رکھنا چاہئے کہ اسے کوئی دلیل نہیں مل سکے گی (لا برھان لہ)۔ جسے دلیل نہیں ملے گی وہ شور مچائے گا۔ یہی اُس وقت ہوتا تھا، یہی آج ہو رہا ہے۔

قرآنی نظام کی بنیاد اس اصلِ عظیم پر ہے کہ دنیا میں کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ محکومیت صرف خدا کے دیئے ہوئے قانون کی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض احکام کی جزئیات بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے اور دیگر احکام کے صرف اصول بیان کرتا ہے۔ جن احکام کے وہ صرف اصول بیان کرتا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کی جزئیات، زمانے کے ساتھ ساتھ بدلنے والی ہیں، ہمیشہ غیر متبدل رہنے والی نہیں۔ ان جزئیات کو قرآنی نظامِ حکومت مرتب کرے گا۔ اسی کا نام اسلامی شریعت ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی شریعت کوئی جامد، غیر متبدل اور متصلب ضابطۂ قانون نہیں بلکہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ رہنے والا نظام ہے جس کے اصول غیر متبدل ہیں۔ ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئیات مرتب فرمائیں۔ حضورؐ کے بعد آپ کے خلفائے کرامؓ نے، حسب ضرورت، اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ان میں ردوبدل کیا۔ اس سلسلے کو بدستور آگے چلتے رہنا تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد خلافت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور تدوینِ شریعت کا یہ سلسلہ بھی رک گیا۔ اب اس سلسلہ کو دوبارہ جاری کرنے کا طریق وہی ہے جسے رسول اللہؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئیات، ہم اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود مرتب کریں۔

یہ تو ہے قرآنی نظام کی تشکیل کا طریق۔ اب سوال یہ ہے کہ اس نظام کے قیام سے مقصود کیا ہے۔ اس کا مقصود قرآن نے اپنے پہلے فقرے میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی رب العالمین۔ اسی کو ربوبیتِ عامہ کہتے ہیں۔ یعنی ایسے معاشرے کا قیام جس میں تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل اس معاشرے کا نظام ہو اور وہ ہر فردِ معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کے کامل نشوونما کیلئے یکساں طور پر اسباب و ذرائع بہم پہنچائے۔ ظاہر ہے کہ اس معاشرے میں نہ کسی کو ذاتی حکومت کے اختیارات حاصل ہوں گے نہ کوئی رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت میں لا سکے گا۔ نہ کوئی دولت سمیٹ کر سرمایہ داری کے جراثیم پھیلا سکے گا نہ کوئی خدا کی زمین پر سانپ بن کر بیٹھ سکے گا۔ نہ اس میں ملوکیت ہوگی نہ ملاازم کی پیشوائیت۔ قرآنی نظام وہ ضربِ کلیمی ہے جس کے سامنے کوئی فرعون (نمائندۂ ملوکیت) ہامان (ترجمانِ پیشوائیت) اور قارون (لعنت سرمایہ داری کا مظہر) سر نہیں اٹھا سکے گا۔ یہ معاشرہ درحقیقت اس زمین پر جنت کا عکس ہوگا۔ اسی میں نوعِ انسان کے قیام کا راز پوشیدہ ہے اور یہی امن عالم کا کفیل ہے۔ لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون۔

طلوعِ اسلام اسی نظامِ قرآنی کے قیام کی طرف دعوت دینے کی تحریک کا نقیب ہے۔ ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام کی مخالفت اربابِ اقتدار کی طرف سے بھی ہوگی اور مدعیانِ مذہب و شریعت کی طرف سے بھی۔ سرمایہ دار طبقہ بھی اسے اپنی مفاد پرستیوں کی راہ میں سنگِ گراں سمجھیگا اور جاگیردار بھی اسے گردن زدنی قرار دے گا۔ طلوعِ اسلام اپنے راستہ کی ان تمام مشکلات سے باخبر ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی بے سروسامانی سے بھی بخوبی آگاہ۔ لیکن، بایں ہمہ، اسے اپنے نصب العین کی صداقت پر اس قدر یقینِ محکم ہے کہ وہ اس راستے کے علاوہ کسی اور راہ کو صراطِ مستقیم سمجھتا ہی نہیں۔ اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے (اور خدا کرے

کہ ایسا بھی کبھی نہ ہو) کہ صعوبات سفر سے ان کے پاؤں شل ہو جائیں اور وہ تھک کر بیٹھ جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کر لے، کہ اس راہ کے علاوہ ہر دوسری راہ تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لے جانے والی ہے۔

یہ ہے طلوع اسلام کا مسلک اور یہ ہے اس کا واضح نصب العین۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے سب سے پہلا مرحلہ، تطہیر فکر کا ہے۔ مسلمان، ہزار برس سے عجمی سازش کا شکار ہو کر دین کی راہ سے ہٹ کر ایک دوسری راہ پر چلا جا رہا ہے۔ یہ دوسری راہ وہ ہے جو عجمی اقوام ثلاثہ (یعنی یہود کی پیشوائیت، عیسائیت کی خانقاہیت اور ایران کی مجوسیت) نے "مذہب" کے نام سے متعین کی اور جو ملوکیت کے سائے میں مولویت اور خانقاہیت کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ یہی قوتیں اس "عجمی اسلام" کی محافظ و نگہبان رہیں اور یہی قوتیں آج بھی اسے سہارا دے رہی ہیں کہ یہ کہیں زمانے کے تھپیڑوں سے گر نہ جائے۔ لیکن برف کے بت، رات کی برودت میں قائم رہ سکتے ہیں، سورج کی ہر کرن ان کے لئے پیغام موت ہوتی ہے۔ اب زمانے کے تقاضے اس قدر شدید ہو رہے ہیں کہ اس قسم کی کھوکھلی لکڑیوں کے آسرے پر، یہ جسد بے روح زیادہ عرصے تک تختِ سلیمانی پر مسلط رہ نہیں سکتا۔ لیکن مسلمان کی نگاہوں پر عقیدت مندی اور اسلاف پرستی کے اسقدر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں کہ یہ زمانے کے ان تقاضوں کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ لہذا سب سے پہلا کام اس کی نگاہوں سے ان پردوں کا ہٹانا ہے۔ اسی کا نام تطہیر فکر ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف مروجہ مذہب کی اصل و حقیقت کو بے نقاب کر کے بتایا جائے کہ یہ وہ دین نہیں جسے خدا نے بھیجا تھا اور دوسری طرف دین حقیقی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کر کے دکھایا جائے کہ یہ ہے اس نظام زندگی کا ضابطہ جسے نوع انسان کے لئے خود خدا نے متعین کیا ہے۔ یہ قرآنی فکر جسقدر عام ہو گی اسی قدر نظام قرآنی کی تشکیل کے لئے فضا سازگار ہوتی جائے گی۔ طلوع اسلام سردست اسی پہلے مرحلے سے گذر رہا ہے۔ اسی مرحلے کا اگلا قدم یہ ہو گا کہ ملک میں ایسے مکاتب (مدرسے اور کالج) قائم کئے جائیں جن میں علوم جدیدہ کے ساتھ ساتھ قرآنی نظام کی تعلیم دی جائے اور اس طرح بچوں کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح قرآنی خطوط پر ہوتی چلی جائے تاکہ بڑے ہونے پر ان میں سے ہر ایک نوجوان، قرآنی نظام کا ایک فعّال عنصر بن جائے۔ یہی وہ نوجوان ہوں گے جن کے ذہنوں کا جلا، قلب کی حرارت، نگاہوں کی وسعت، پیشانیوں کا نور، خون کی گرمجوشی، بازوؤں کی قوت اور قدموں کی استقامت، ایک سیلاب بے پناہ بن کر اس گندگی اور غیر خدائی نظام کے قصر مشید کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی۔ اور اس کے بعد پھر سے وہ نظام ربوبیت قائم ہو سکے گا جسے آسمان کی آنکھ نے ایک مرتبہ دیکھا ہے اور اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آجتک سرگرداں اور دن اور رات چشم براہ ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ نظام قائم ہو کر رہے گا، ورنہ قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنا قطعاً بے سود تھا۔ یہ کب قائم ہو گا؟ اس کا انحصار ہے ہماری جدوجہد اور سعی و عمل پر، کہ جنت کی وراثت یکسر عمل کا نتیجہ بتائی گئی ہے۔ اس وقت ساری دنیا، اپنے اپنے غلط نظامہائے زندگی کے انسانیت سوز نتائج و عواقب سے تنگ آ کر، ایک نئے نظام کی تلاش میں، مضطرب و بیقرار پھر رہی ہے۔ چونکہ ان اقوام عالم کے سامنے وحی کی روشنی نہیں اس لئے وہ اپنے ظن و تخمین کی وادیوں میں اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی کا سر پھٹتا ہے، کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹتی ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اگلی لاٹھی کدھر سے اٹھے گی اور کس کے

جائے گی۔ دنیا میں، اس سے قبل، شاید ہی کوئی دور ایسا آیا ہو جس میں پوری کی پوری انسانیت، اپنے بنائے ہوئے زندان سے نکلنے کے لئے اس طرح تڑپ رہی ہو۔ غور کیجئے کہ ان حالات میں، اس قوم پر جسے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور جسے ضابطۂ قوانینِ خداوندی کا امین بنایا گیا تھا، کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن اس قوم کی حالت یہ ہے کہ وہ خدا کے عطا فرمودہ جگمگاتے ہوئے چراغ کو تہِ دامن چھپائے بیٹھی ہے اور اس طرح خود بھی اس کی روشنی سے محروم ہے اور باقی دنیا کو بھی اندھیرے میں رکھے ہوئے ہے۔ اگر اسے تعلّی پر محمول نہ کیا جائے (بلکہ تحدیثِ نعمت سمجھا جائے) تو یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں کہ اسوقت (عرشی صاحب کے الفاظ میں) ساری دنیا میں صرف طلوعِ اسلام اس آواز کو بلند کر رہا ہے کہ اس "ید بیضا" کو پھر سے آستین سے باہر نکال کر دنیا کو بقعۂ نور بنا دو تاکہ اس کی روشنی میں تم بھی جانبِ منزل جادہ پیما ہو سکو اور تمہارے پیچھے پیچھے باقی دنیا بھی امن و عافیت کی جنت کی طرف گامزن ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ آواز اس وقت بڑی کمزور ہے اور اس کا حلقہ بڑا محدود۔ لیکن اسے صورِ قیامت بنا دینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آواز فی الواقعہ حق اور صداقت کی آواز ہے تو اسے نشیدِ کامرانی بنانے میں جو مدد بھی آپ کر سکیں گے وہ قرآنی نظام کے قیام کی راہ میں ایک قدم آگے بڑھانے کے مرادف ہوگا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے قطرے، دریا بن جاتے ہیں اور افراد، کارواں کی صورت اختیار کر کے، راستہ کی پرخطر گھاٹیوں سے محفوظ و مصئون، جانبِ منزل رواں دواں بڑھے چلے جاتے ہیں۔ ہم افراد سے زیادہ، ان اداروں کی توجہ بھی اس نقطہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں، جو قرآنی نظام کی تشکیل کو اپنا مطمحِ نگاہ سمجھتے ہیں، کہ اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ طلوعِ اسلام کا قدم صحیح راہ پر اٹھ رہا ہے، تو الگ الگ منتشر کوششوں کی بجائے، وہ اسی کو اپنی سعی و عمل کا مظہر کیوں نہ بنا لیں؟ اس سے، اس منزل کی طرف جانے والے تمام افراد کے لئے وحدتِ مرکز اور ہم آہنگی فکر و عمل پیدا ہو جائے گی جو نظامِ قرآنی کے لئے اصل و بنیاد ہے۔ ابتداءً نیتیں کتنی ہی نیک اور دل کیسے ہی پرخلوص کیوں نہ ہوں، الگ الگ مراکز سے، آگے چل کر، الگ الگ فرقے بن جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ اس لئے یہ، قرآنی نگاہ رکھنے والے تمام افرادِ ملت کے خیالات کا ترجمان ہے۔ بنا بریں، اس نہج کے لکھنے والے اسی میں لکھیں اور ان خیالات کو پھیلانے کا جذبہ رکھنے والے، اسی کو پھیلائیں۔ اس سے اس قرآن برادری کے افراد، تشتتِ فکر و نظر اور انتشارِ سعی و عمل سے بچ جائیں گے۔

بہرکیف، افراد ہوں یا ادارے، جو بھی طلوعِ اسلام کے مسلک سے متفق ہوں، ان کی ہر کوشش، اس آواز کو آگے بڑھانے کا موجب اور اس تحریک کی تقویت کا باعث ہوگی۔ اس باب میں ہمیں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جو اسے اپنا فریضۂ حیات سمجھتا ہے وہ از خود اس میں شرکت کرے گا۔ جو ایسا نہیں سمجھتا، اس سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ بیکار ہی نہیں بلکہ اس کی کوئی امداد (جو بہرحال طوعاً نہیں بلکہ کرہاً ہوگی) اس تحریک کی راہ میں الٹا روڑا بن کر اٹک جائے گی، جس طرح مجبوراً ساتھ چلنے والے کا ساتھ، ہمرہانِ سفر کے لئے، زنجیرِ پا بن جایا کرتا ہے۔ بطیبِ خاطر چلنے والے آئیں اور راہ نوردانِ شوق کے اس قافلے میں شامل ہو جائیں جو سر میں سودائے عشق، دل میں ذوقِ تجسس، نگاہوں میں کیفِ آرزو

اور ہاتھ میں قندیلِ قرآنی لئے، ستاروں کی سی خاموشی اور نرم روی سے، بے ساز و یراق جانبِ منزل بڑھے چلا جا رہا ہے۔ زادِ راہ کی کمی، مخالفتوں کا ہجوم، حالات کی نامساعدت چھلاوے بن بن کر ڈرا رہی ہے لیکن افق کے اُس پار سے آنے والی ایک بے صوت صدا ہے جو نغمۂ جبریل کی طرح یہ کہتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہے کہ

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ
الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ۰
نحن اولیاءکم فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ ولکم فیھا ما
تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون ۰ نزلا من غفور رحیم ۰
ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ
وعمل صالحا وقال انني من المسلمین ۰

ان حسین آرزوؤں اور تابناک تمناؤں کے جلو میں، طلوعِ اسلام اپنی زندگی کے اس نئے سال میں قدم رکھتا ہے۔

خاکِ ما خیز د کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم۔

ایک ضروری اطلاع

طلوعِ اسلام کے ابتدائی دو سال میں، محترم پرویز صاحب کے بعض ایسے اہم مقالات زیبِ دہ اوراق ہوئے تھے جنھوں نے ہر سوچنے والے کے قلب و نگاہ میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ان مضامین کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے بعض دوبارہ چھاپے گئے لیکن اس پر بھی ان پرچوں کی ایک کاپی بھی کہیں سے نہیں ملتی اور ان مضامین کی مانگ بدستور چلی آ رہی ہے۔ لہٰذا بریں، جو حضرات ان مضامین کی اشاعت کے بعد سے حلقہ طلوعِ اسلام میں شامل ہوئے ہیں انھوں نے ان مضامین کو ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا۔ اور جب ان کا حوالہ کسی دوسرے مضمون میں آتا ہے تو وہ اسے طلب کرتے ہیں۔

ان مسلسل تقاضوں کے پیشِ نظر فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان مضامین کو طلوعِ اسلام میں پھر سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ ارادہ ہے کہ آئندہ اشاعت میں ان میں سے سب سے اہم مقالہ "اسبابِ زوالِ امت" محترم پرویز صاحب کی نظرِ ثانی کے بعد، شائع کر دیا جائے۔ جو احباب (معہ ایجنٹ صاحبان) اس پرچہ کی زیادہ کاپیاں لینا چاہیں وہ پہلے اطلاع فرما دیں تاکہ پرچہ اس تعداد کے مطابق چھاپا جائے۔ اس کے بعد، ان اہم مضامین میں سے اور بھی اسی طرح شائع کر دیئے جائیں گے۔ کذالك نصرف الآیات لقوم یشکرون۔

لمعات

میر انیس نے کہا تھا:

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے　　رخصت سے پھر آکے منہ دکھایا ہے تجھے
اب کیوں نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر　　میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

مثال تو کچھ اچھی نہیں، لیکن چونکہ تشبیہ تام ہے اس لئے وہ مسلمان جو آگ اور خون کے دریا پیر کر پاکستان پہنچے ہیں، یہاں کے ہر گلی کوچہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ــــ مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے ــــ اور یہاں کے ذرے ذرے سے تخاطب کر سکتے ہیں کہ ــــ میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے ــــ دنیا کی قوموں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں، لیکن یہ واقعہ، تاریخ کے صفحات میں شاید ہی کہیں اور ملے کہ کسی قوم نے آزادی تو حاصل کرلی ہو بغیر ایک قطرۂ خون بہائے، لیکن اسے محض اپنے مستقر تک پہنچنے کے لئے اس طرح آغشتہ خاک وخون ہونا پڑے۔ ہم اپنے افلاس تدبر اور فقدانِ اہلیت کو چھپانے اور اس طرح اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنے کے لئے لاکھ کہیں کہ مسلمانوں نے حصولِ آزادی کی خاطر اسقدر قربانیاں دی ہیں۔ لیکن اس طرح خونِ ناحق کے وہ دھبے کبھی نہیں مٹ سکتے جن سے ہم زمانے کی ریگِ رواں کو شفق آگیں بنا چکے ہیں، نہ ہی وہ لٹی ہوئی عصمتیں واپس مل سکتی ہیں جو ناموس وشرافت کی ہر عدالت میں ہماری ملی بے حمیتی کی زندہ شہادتیں ہیں۔ ہم میں سے وہ کبوترانِ حرم،[۱] جو تقسیمِ ہند کی قیامتِ صغریٰ سے پہلے ہی اڑکر بامِ پاکستان پر آبیٹھے تھے، انھیں کیا علم کہ صحنِ گلستاں میں بارہا مرغانِ رشتہ برپا پر کیا گذری تھی؟

بسمل کے لوٹنے کی کسی دل کو کیا خبر　　کس کے گلے چھری چلی قاتل کو کیا خبر
رستے میں کون لٹ گیا منزل کو کیا خبر　　کشتی کے ڈوب جانے کی ساحل کو کیا خبر

خاروں سے پوچھئے نہ کسی گل سے پوچھئے
صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھئے

[۱] نوائے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی　　طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را

لیکن مسلمانوں نے یہ ساری لرزہ انگیز مصیبتیں اور قیامت خیز صعوبتیں اس لئے برداشت کیں کہ ان کے ذہن میں تھا کہ وہ محکومی اور غلامی کے انسانیت سوز جہنم سے نکل کر، حریت و آزادی کی انسانیت ساز جنت کی طرف جا رہے ہیں۔ کس قدر حسین تھا یہ خیال اور کیسی دلکش تھی یہ تمنا۔ اس بات کو قریب ساڑھے چار برس ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان عوام نے جو سر پر یہ سودا لیکر آئے تھے، اس جنت کو پا لیا؟

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد کچھ ایسے چھوئی موئی واقعہ ہوئے ہیں کہ پاکستان کی داخلی کمزوریوں میں سے کسی کا ذرا سا بھی ذکر چھیڑیئے، ان کا کلیجہ فوراً دھک دھک کرنے لگ جاتا ہے کہ ان پر کوئی آفت آئی۔ یحسبون کل صیحۃ علیھم۔ کہیں پتہ کھٹکا اور انھوں نے کان کھڑے کئے۔ کونسا ملک ہے جس میں کمزوریاں نہیں اور کونسی قوم ہے جو لغزشوں اور کوتاہیوں سے منزہ ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ خوش نصیب ممالک اور فیروز بخت اقوام اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دل کے کانوں سے سنتی ہیں اور پھر ان کی تلافی کی کوشش کرتی ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان کی سیئات مبدل بہ حسنات ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن جن قوموں کے "ستارے گردش میں ہوں" وہ اپنی کمزوریوں کے تذکرے کو کبھی گوارا نہیں کرتیں۔ اس سے ان کا خون کھولنے لگ جاتا ہے اور ان کی پیشانی پر جبر کے نقشے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ ان کے عیوب و اسقام ان کے سامنے آتے ہیں نہ ان کی اصلاح کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بدبختی سے یہی صورت پیدا ہو چکی ہے اس لئے یہاں ہر سوچنے والا دماغ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی کشمکشِ پنہاں میں مبتلا ہے جو (بقولِ غالب) اس کے دلِ پرحسرت کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا تحفظ سب سے مقدم ہے۔ اس سے کس صحیح العقل انسان کو انکار ہو سکتا ہے؟ جس پاکستان سے ہم دل کی گہرائیوں سے، کہتے ہیں کہ

میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

اس سے زیادہ گراں بہا متاع اور کونسی ہو سکتی ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان سے مراد کیا ہے؟ اگر پاکستان سے مراد ہے فقط ایک خطۂ زمین جو چاروں طرف سے جغرافیائی حدود سے گھرا ہوا ہے، تو اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ خطۂ زمین مقصود بالذات ہے، یا کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک خطۂ زمین، خواہ وہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، کبھی مقصود بالذات نہیں ہو سکتا۔ اس کی قیمت اسی میں ہوتی ہے کہ وہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس خطۂ زمین میں ایک قوم اپنی مملکت قائم کرتی ہے۔ مملکت بھی مقصود بالذات شے نہیں۔ یہ بھی کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ عام

انسانوں کے نزدیک اپنی مملکت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی خوشحالی اور خیر سامانی کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس سے دنیا کی نگاہ میں ان کا وقار قائم ہوتا ہے اور اس طرح وہ عزت اور طمانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن کا حامل مسلمان اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس کے نزدیک اپنی مملکت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظامِ عدل و ربوبیت کے قیام کا ذریعہ بنتی ہے جو قوانینِ خداوندی کی رو سے متشکل ہوتا ہے اور جس میں افرادِ انسانیہ لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون کی جنت میں بستے ہیں۔ کسی خطۂ زمین کا تحفظ اسلئے ضروری ہوتا ہے کہ اس سے یہ مقاصد وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ بنیاد ہوتی ہے ایک عمارت کی۔ پٹڑی ہوتی ہے ایک گاڑی کے چلنے کی۔ عمارت کے بغیر بنیاد کی قیمت کیا ہے؟ گاڑی کے بغیر پٹڑی کی حفاظت کے کیا معنی ہیں؟ گودی میں کھڑا جہاز سب سے زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن کیا جہازوں کو گودیوں میں کھڑا رکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے؟ لہذا پاکستان کے استحکام سے مقصود یہ ہے کہ یہ ہمارے تصوراتِ حیات اور نظریاتِ زندگی کی کہکشاں گیر عمارت کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم نے اسے جان دے کے پایا اور مر مر کے بنایا ہے۔ ہم اپنے خون سے اس کی حفاظت کریں گے۔ لیکن اس بنیاد پر کوئی عمارت بھی تو بنے! پاکستان کی ساڑھے چار سالہ زندگی پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اس بنیاد پر کوئی ایک ردا بھی کہیں رکھا گیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے ہاں دولت سیلاب کی طرح امنڈے چلی آرہی ہے۔ حتیٰ کہ اب ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دولت کو کریں کیا؟ لیکن 'قوم' اس طبقے کا نام تو نہیں۔ قوم تو ان سے الگ کہیں اور بستی ہے! بستی کا ہے کو ہے، زندگی کے سانس گن رہی ہے۔ لیکن اس طبقے کے محلات اس قدر بلند ہیں کہ وہاں سے نیچے فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑنے والی قوم دکھائی تک بھی نہیں دیتی۔ دولت کی فراوانی سے کوئی عیب ایسا نہیں جو ان کی سوسائٹی میں حسن نہ بن چکا ہو، کوئی برائی ایسی نہیں جس کا لائسنس عام نہ ہو چکا ہو۔

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

"اربابِ شریعت" سے اس طبقے کا ساجھا ہے اور اس کی وجہ سے یہ حضرات بھی اس ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ تشکیلِ پاکستان سے پہلے وہ ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ انھیں اب وہ سب کچھ میسر ہے (کوٹھیاں۔ ٹیلی فون۔ موٹریں۔ فیکٹریاں) جنھیں اس سے پہلے، یہ للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اور اپنی ہوسِ ناکام کی تسکین کے لئے، ان چیزوں کو "دنیا کے کتوں" کا حصہ بتایا کرتے تھے۔ ان میں سے جس کے حصے میں کچھ کمی ہو جاتی ہے وہ اربابِ ثروت و اقتدار

کی پارٹیوں کی شراب اوران کی بیویوں کی بے پردگی کو چوراہے میں اچھالتا ہے اورجب اس کا مقصد حاصل ہوجاتا ہے تو پھر برسرِ منبر گنگنانا شروع کردیتا ہے کہ

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

اوراس کے بعد، جس طرح اس سے پہلے، اسکولوں کے بچے "برکاتِ عہدِ انگلشیہ" کی تفاصیل دھرایا کرتے تھے، یہ حضرات، دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کی "اسلامی خدمات" کی فہرست گنانا شروع کردیتے ہیں۔ مثلاً، قرارداد مقاصد پاس کرنے سے یہ مملکت مسلمان ہوگئی ہے۔ رمضان شریف میں شراب کی دکانیں بند کرادی جاتی ہیں اور ہوٹلوں کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ تراویح کی نماز کے لئے بدھنے اور مصلے بہم پہنچا دیئے جاتے ہیں اور ٹریم کا وقت بارہ بجے رات تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ رمضان، عید اور شبرات میں چینی کا کوٹا زیادہ کردیا جاتا ہے۔ رمضان میں دفاتر کے اوقات میں تبدیلی کردی جاتی ہے۔ جمعے کے مبارک دن کو دفاتر بارہ بجے بند کردیئے جاتے ہیں۔ محرم میں ریڈیو پر گانے کے ساتھ ساز نہیں بجائے جاتے۔ کسی بڑے آدمی کی وفات پر ریڈیو سے مسلسل قرآن خوانی ہوتی رہتی ہے۔ ریڈیو کی نئی عمارت میں قرآن کریم کی آیت (قولوا للناس حسنا) نہایت جلی حروف میں لکھی گئی ہے۔ کراچی ایڈمنسٹریشن نے فطرانے اور کھالیں جمع کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر قبلے کا رخ دکھانے کیلئے تیر کے نشانات لگا دیئے گئے ہیں۔ ریڈیو پر ہر صبح قرآن کریم کا درس دیا جاتا ہے (جس میں واؤ کے معنی اور بتائے جاتے ہیں)۔ عید میلاد النبیؐ کی تقریب سرکاری طور پر منائی جاتی ہے۔ ٹرومین کو قرآن شریف بطور تحفہ دیا گیا ہے۔ قائداعظم کی یادگار میں ایک دارالعلوم کی تعمیر کا اعلان کیا گیا ہے۔

اب اور چاہتے کیا ہو؟ ——— پیمبری مل جائے!

قوم یہ وعظ سنتی ہے اور "یا اللہ تیرا شکر" کہہ کر پھر فٹ پاتھ پر ہڈیاں رگڑنے لگ جاتی ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ کیا یہی تھی وہ عمارت جس کے لئے سرزمینِ پاکستان کو بطور اساس و بنیاد حاصل کیا گیا تھا؟ کیا یہی تھا وہ مقصد جس کے لئے مسلمان نے اسے جان دیکے پایا اور مرمر کے بنایا تھا؟ کیا یہ بعینہٖ وہی کچھ نہیں جو مسلمانوں کے دیگر ممالک، مثل افغانستان، ایران، عراق، نجد، حجاز، وغیرہ میں ہورہا ہے۔ اگر یہ وہی کچھ ہے تو کیا یہاں بھی اس کے نتائج وہی کچھ نہیں نکلیں گے جو ان ممالک میں برآمد ہوچکے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ دنیا کی زندہ قوموں میں کسی قطار اور شمار میں ہی نہیں۔ وہاں بھی یہی کیفیت ہے کہ ایک طبقہ سب کچھ سنبھالے اور سمیٹے ہوئے ہے اور باقی قوم کیچڑ کے کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی زندگی کے دن پورے کررہی ہے؟ یہ سب کچھ اسلامی ممالک کی شان ہے۔ ان کے برعکس، دنیا کے ملحدوں اور بے دینوں کے ممالک کو دیکھئے۔ ان میں سے بھی اسکی مثال لیجئے

(یعنی انگلستان کی) جسے سرمایہ داروں کا ملک کہا جاتا ہے۔ وہاں کوئی بیکار ایسا نہیں جس کا روزینہ مقرر نہیں۔ کوئی بیمار ایسا نہیں جس کا مفت علاج نہیں ہوتا۔ کوئی بچہ ایسا نہیں جس کی پرورش اور تعلیم کا انتظام نہیں۔ کوئی بوڑھا ایسا نہیں جس کی پنشن متعین نہیں۔ دولت وہاں بھی اوپر ہی کے طبقے میں گردش کرتی ہے لیکن بایں ہمہ نیچے کے طبقے کا کوئی فرد نہیں جو ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائے۔ یہ تو مغرب کی کیفیت ہے۔ اب اسی قسم کے ملحد اور بے دین ایک مشرقی ملک کو لیجئے اور وہاں طبعی ضروریات نہیں بلکہ اخلاقی معیار کو دیکھئے۔ (ہمارے ایک دوست نے جو ابھی جاپان سے آئے ہیں بتایا کہ وہاں) کوئی شخص جانتا ہی نہیں کہ جھوٹ بولنا کسے کہتے ہیں۔ مکانوں میں تالا لگانے کا سامان ہی نہیں ہوتا۔ وہاں کسی کی کوئی چیز چوری نہیں جاتی۔ وہاں ریلوں میں کوئی ٹکٹ ہی نہیں پوچھتا کیونکہ وہاں کوئی شخص بلا ٹکٹ سفر نہیں کرتا۔ ان کے لغت میں گالی کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ یہ ملحدوں اور بے دینوں کے ممالک ہیں۔ ان کی طرف دیکھئے اور ـــــ باز بخویشتن نگر۔

آپ یہ سب کچھ سننے کے بعد کہدیں گے کہ

کچھ ہوش میں آنے کی میرے شکل بھی ناصح! یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

"ہوش میں آنے کی شکل" نہ تو ان اسمبلیوں سے پیدا ہو سکے گی نہ وزارتوں کے کابینوں سے۔ نہ یہ ملا کے حجروں سے ابھرے گی نہ شیخ طریقت کی خانقاہوں سے۔ اس کی ابتداء (جیسا کہ ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں) درسگاہوں سے ہوگی۔ قرآن نے اس کی شکل یہی بتائی ہے جب اس نے کہا کہ نظامِ ربوبیت کے قیام کی صورت ہے بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون۔ ضابطہ قانون خداوندی کو سمجھنا اور سمجھانا اور اسے اسقدر دہرانا کہ یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا تھا اور آج اسے پھر دہراتے ہیں کہ جو لوگ اس طریق کار کی اہمیت پہچانتے ہوں وہ کچھ دقت کے لئے تصور کرلیں کہ ابھی ہم پہلے دور ہی میں ہیں۔ وہ سرسید بنکر اٹھیں اور ملک میں دو چار ایسی درسگاہیں قائم کردیں جن میں قرآن کی تعلیم دی جائے۔ ملا کے قرآن کی نہیں، خدا کے قرآن کی جو انسان کو صرف تسخیرِ ارض و سموٰت کے راز ہی نہیں بتاتا بلکہ اس پر اقطار السموٰت والارض سے آگے نکل جانے کی راہیں بھی کشادہ کردیتا ہے۔ ان منجمد انسانوں کو چھوڑ دو کہ جنہوں نے جو کچھ بننا تھا بن چکے۔ اپنی تمام توجہات مرکوز کردو ان سیال قلوب پر (یعنی آنیوالی نسلوں پر) جنہیں تم جس قالب میں ڈھالنا چاہو ڈھال سکتے ہو۔ اس سرزمین کی حفاظت کا انتظام رکھو اور اس متاعِ عظیم کے امین تیار کرنے کیلئے درسگاہیں تیار کرو۔ ہم میں قرآن سکھانے والے موجود ہیں۔ قرآن سیکھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ بس ان دونوں میں رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ رابطہ درسگاہوں سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ملک کے ان خطوں میں جن کی آب و ہوا نہایت عمدہ ہو شہروں سے ذرا دور، دایۂ فطرت کی گود میں اقامتی درسگاہیں

تعمیر کردی جائیں جہاں بچوں کی تعلیم و تربیت و پرورش کا سارا انتظام موجود ہو۔ دس پندرہ برس تک نہایت خاموشی سے ان درسگاہوں کو مصروفِ تعلیم و تربیت رہنے دو۔ اس کے بعد دیکھو کہ ان میں سے کس قسم کے شہباز نکلتے ہیں۔ اسی قسم کے شہباز کہ

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا

سیاستدانوں کے ہنگامے انہی کے حوالے کردو۔ بزنس والوں کو چور بازاری کی بھول بھلیاں میں الجھا رہنے دو۔ ملاکو قوم کی عاقبت سنوارکر اپنی روٹی کمانے کے دھندے میں لگا رہنے دو۔ یہ سب میدان ان کے لئے چھوڑ دو اور تم قوم کے بچوں کو سنبھال لو۔

لٹا دے دولتِ کونین اور میرے لئے بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دے

تم دیکھو گے کہ آخر الامر ان سب کی متاع کاسد ثابت ہوگی۔ ان کے کاروبار میں نقصان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ ان کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ لیکن جس تخم صالح کی تم آبیاری کروگے وہ ایک دن ایسا تناور درخت بن جائیگا جس کی شاخیں فضائے عالم میں مرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں گی۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء۔ قوم وہی زندہ رہ سکتی ہے جو مفاد عاجلہ (دنیا۔ پیش پا افتادہ مفاد) پر مستقبل کی خوشگواریوں کو ترجیح دے۔ وبالاخرۃ ھم یوقنون۔ اولئک علیٰ ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون۔

آپ کی بے عملی یہ کہکر آپ کو فریب دے دیگی کہ دنیا برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ قوموں کی تقدیریں صبح شام بدل رہی ہیں۔ بین الاقوامی حالات قدم قدم پر پلٹا لے رہے ہیں۔ مزاجِ روزگار اتنی سرعت سے بدل رہا ہے اور ہمیں ایک ایسا پروگرام بتایا جا رہا ہے جس میں دس پندرہ سال انتظار ہی میں گزر جائیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو چالیس دن تک پلاسٹر میں رکھنا ہی ہوگا خواہ اتنی دیر میں قافلہ کتنا ہی آگے کیوں نہ بڑھ جائے۔ تپ دق کا علاج کبھی ایک رات میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مہینوں بلکہ بعض اوقات برسوں تک سینی ٹوریم میں رہنا پڑتا ہے۔ آپ اس پروگرام کو یہ کہکر نہ ٹال دیجئے کہ ـــــ آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک ـــــ اگر آپ نے اس پروگرام کو تشکیل پاتے ہی فوری بعد شروع کر دیا ہوتا تو اسوقت تک اس کی ایک تہائی منزل ختم ہو چکی ہوتی۔ اگر آپ اسے اب بھی شروع کر دیں تو ہر گزرنے والا دن آپ کے عرصۂ انتظار میں کمی کرتا جائیگا۔ تیزی سے بڑھنے والے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے، جو کچھ اور لوگ کرنا چاہیں، انھیں کرنے دیجئے۔ لیکن آپ اس سست گام طریق کار کو اپنے ہاتھ میں لیجئے۔ اس کے نتائج نہایت درخشندہ اور پائیدار ہونگے۔ واللہ علیٰ ما نقول شھید۔

رحمۃ اللعالمین

[محترم پرویز صاحب کی تقریر جو ۱۲ دسمبر کی شام بتقریب عید میلاد النبی ریڈیو اسٹیشن کراچی سے نشر ہوئی اور جسے ریڈیو پاکستان کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام]

یہ قرآن کا ارشاد ہے اور ہمارا ایمان کہ حضور نبی اکرم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تمام اقوام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ وما ارسلناک الا رحمۃ اللعالمین۔ غیر مسلم اقوام بجا طور پر یہ سوال کر سکتی ہیں کہ مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے متعلق جو عقیدہ چاہیں رکھیں، لیکن وہ یہ دعوے کس طرح کر سکتے ہیں کہ ان کے پیغمبرؐ کا ظہور دوسری اقوام کے لئے بھی رحمت ہے؟ یہ سوال غور طلب ہے اور اس کے جواب کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ ذمہ داری کے علاوہ یہ دعویٰ اتنا بڑا ہے کہ خود اس کی اہمیت اس کے ثبوت کی متقاضی ہے۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کی رسالت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔ وہ اُن تمام بندشوں کو توڑ دے گا جو نوع انسان کی حریت و آزادی کی راہ میں حائل تھیں اور ان تمام زنجیروں کو کاٹ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔

ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کونسی زنجیریں تھیں جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور نبی اکرمؐ نے ان زنجیروں کو کس طرح توڑا۔

سب سے پہلے نظامِ حکومت کو لیجئے۔ انسانوں کو دنیا میں مل جل کر رہنا ہے، اس کے سوا ان کی زندگی کی کوئی اور صورت نہیں۔ مل جل کر رہنے سے باہمی مفاد کا ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ اس ٹکراؤ سے نزاع اور اختلاف پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ فساد ہے۔ لہٰذا انسان کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ مل جل کر رہنے کی کونسی شکل پیدا کی جائے جس سے اختلافات اور نزاعات پیدا نہ ہوں۔ اور اگر پیدا ہوں تو ان کا تصفیہ امن اور سلامتی سے ہو جایا کرے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے اس نے جو صورت تجویز کی اسے نظامِ حکومت کہتے ہیں۔ حکومت کا وجود تو عمل میں آیا اس ضرورت کے ماتحت، لیکن ہوا یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا انھوں نے اسے خود اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ انھیں خدشہ تھا کہ ان کی اس مستبدانہ روش کے خلاف لوگوں کے دل میں بغاوت کے خیالات پیدا ہو جائیں گے اس لئے انھوں نے آہستہ آہستہ اس قسم کا عقیدہ پیدا کر دیا کہ بادشاہ خدائی اختیارات کا مالک ہوتا ہے اور دوسرے انسان اس کی خدمت اور اطاعت کیلئے پیدا ہوتے ہیں۔ ظہور نبی اکرمؐ کے وقت تمام مہذب دنیا کی یہی حالت تھی۔ ہر ملک اور ہر قوم میں تمام اقتدارات بادشاہ کے ہاتھ میں تھے۔ جسے ایشور کا اوتار اور خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا اور باقی انسان اس کی خدمت گزاری اور فرماں پذیری کیلئے زندہ رکھے جاتے تھے۔ مدتوں کی غلامی سے دنیا اس نظامِ حکومت کی اس درجہ خوگر ہو چکی تھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور نظامِ حکومت ان کے تصور میں بھی نہیں آتا تھا۔

نبی اکرمؐ تشریف لائے اور انھوں نے ساری دنیا کو للکار کر کہا کہ یاد رکھو! کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر اپنی مرضی چلائے۔ انسانوں کے باہمی معاملات کا فیصلہ ان کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیئے۔ یعنی نظام حکومت مشاورتی ہونا چاہیئے نہ کہ شخصی اور استبدادی۔ اس ایک آواز نے غلامی اور محکومی، زیردستی اور فرماں پذیری کی ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر الگ پھینکدیا جس میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آرہی تھی۔ آج ساری دنیا اس مشاورتی نظام کو بہترین نظام اجتماعیہ قرار دے رہی ہے۔ اگر آج سے تیرہ سو سال پہلے صحرائے حجاز سے یہ آواز نہ اٹھتی، تو سوچئے کہ آج دنیا کی کیا حالت ہوتی؟ کیا یہ آواز تمام نوعِ انسانی کے لئے نشیبِ رحمت نہیں ثابت ہوئی؟

اب ایک اور سمت دیکھئے۔ ملوکیت کی غلامی انسان کے جسم کی غلامی تھی لیکن اس سے بدتر ایک اور غلامی تھی جس کے طوق وسلاسل میں انسان کی روح جکڑی ہوئی تھی۔ یہ غلامی تھی پیشوائیت (Priesthood) کی غلامی۔ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی سے انسان کی یہی دنیا برباد ہوتی تھی۔ لیکن مذہبی پیشواؤں کے ارشاد کی تکمیل میں ذرا سی کوتاہی، دنیا اور آخرت دونوں میں ذلت ورسوائی کا موجب بن جاتی تھی۔ اس لئے ان کی حکومت انسان کی روح پر چھائی ہوئی تھی۔ اور ان کی ہیبت اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست اور اس کے خون کے ذروں میں حلول کر چکی تھی۔ نبی اکرمؐ آئے اور آپ نے ساری دنیا کو پکار کر کہہ دیا کہ یاد رکھو! خدا اور اس کے بندے کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ بارگاہِ خداوندی کا حاجب و دربان بن کر بیٹھ جائے۔ اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ اس آوازۂ حریت سے باطل کی عقیدتمندیوں کی تمام زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں اور نوعِ انسانی نے پیشوائیت کی غلامی کے عذاب سے نجات حاصل کر لی۔ سوچئے کہ اگر ساتویں صدی عیسوی میں یہ حریت آموز اور انقلاب آفریں آواز بلند نہ ہوتی تو آج روحِ انسانیت کن زنجیروں میں جکڑی ہوتی! کیا یہ آواز ساری دنیا کے لئے نویدِ رحمت نہیں بنی؟

ملوکیت اور پیشوائیت نے اپنے استبداد کی زنجیریں مضبوط کرنے کے لئے یہ عقیدہ وضع کر رکھا تھا کہ کچھ انسان پیدائشی طور پر حکومت اور پرستش کے حقوق لیکر آتے ہیں۔ اور دوسرے انسان جنم ہی سے نیچ قوموں میں لیتے ہیں۔ انسانوں کی یہ تقسیم خود خدا کی متعین کردہ ہے اس لئے اس کے خلاف لب کشائی خدا کے فیصلوں کے خلاف سرکشی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ فریبِ ملوکیت و پیشوائیت ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ احترامِ آدمیت کا پرچم بلند کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ساری دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یاد رکھو! پیدائش کے اعتبار سے چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ عزت اور تکریم کا معیار انسان کے ذاتی جوہر ہیں، نہ کہ خاندان کی نسبتیں۔ پیدائشی نسبتوں سے معاشرے میں امتیازی خطوط کھینچنے والے، فسادِ آدمیت کے جرمِ عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس آواز نے تمام انسانوں کو ایک صف میں لاکر کھڑا کر دیا اور اس طرح پیدائشی امتیازات کے وہ تمام بندھن ٹوٹ گئے جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ پوچھئے تاریخِ عمرانیت کے مبصرین سے کہ اگر دنیا میں یہ آواز بلند نہ ہوتی تو آج دنیا کس دور سے گذر رہی ہوتی!

اور آگے بڑھئے! انسانوں نے مختلف ملکوں اور خطوں میں بسنا شروع کیا اور یہی خطے ان کا وطن قرار پا گئے۔ اس سے زیادہ ان جغرافیائی حدود کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ لیکن ذہن انسانی کی تنگ نظری سے دریاؤں اور ندیوں کی یہی لکیریں قومی امتیازات کے سانپ بن گئیں۔ اور اس کے بعد ہر خطے کا انسان دوسرے خطے کے انسانوں کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یہی وہ قومیت پرستی (نیشنلزم) ہے جو دنیا میں اس قدر کشت و خون اور تباہی و بربادی کا موجب بن رہی ہے۔ حضور نبی اکرم ؐ نے تمام دنیا کو پکار کر کہدیا کہ تمہارے وطنوں کی لکیریں خود ساختہ ہیں۔ تمام انسان بلا تمیز رنگ و نسل و زبان دو وطن ایک درخت کی شاخیں اور ایک کنبے کے افراد ہیں۔ ان سب کو ایک بن کر رہنا ہوگا۔ کیونکہ ان سب کی حیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ آج ساری دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کی جو آوازیں اٹھ رہی ہیں کیا وہ اسی پیغامِ وحدتِ انسانیت کی صدائے بازگشت نہیں؟ سوچئے کہ اگر فضائے عالم اس آواز سے ناآشنا ہوتی تو کسی ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ ساری دنیا کے انسانوں کو ایک برادری کی طرح، ایک عالمگیر نظام کے تابع زندگی بسر کرنی چاہئے؟

اب انسان کی زندگی کے ایک اور گوشے کو لیجئے۔ انسان کی حالت یہ تھی کہ مذہبی دنیا میں ہر فرد اپنی اپنی نجات کی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا اور معاشی دنیا میں ہر شخص اپنے مفاد کی فکر میں سرگرداں و حیراں۔ یعنی ساری دنیا میں محض افراد (INDIVIDUALS) بستے تھے۔ انسانیت (Humanity) کا کہیں وجود نہ تھا۔ سوچئے کہ جس دنیا میں ہر فرد اپنی اپنی فکر میں مضطرب و بے چین پھر رہا ہو اس میں کس قدر نفسا نفسی کی قیامت برپا ہوگی؟ اس تخم انفرادیت کا نتیجہ وہ شجرِ خبیثہ ہے جسے سرمایہ داری کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں ہر انسان دوسرے کا خون پی جانے کی فکر میں رہتا ہے۔ دنیا اس جہنم سے گذر رہی تھی کہ نوعِ انسانی کا وہ محسن اعظم ؐ آیا اور اس نے وحدت انسانیت کی چھپی ہوئی حقیقت کو اس طرح اجاگر کر کے دکھا دیا کہ ہر فرد کو دوسرے افراد کی پرورش اور تربیت میں خود اپنی ذات کی بالیدگی اور بردمندی نظر آنے لگی۔ اس نے کہا کہ جو نظام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کے اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کا ذمہ وار نہیں بنتا، اسے دنیا میں قائم رہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ پیغام نہ تھا ایک زلزلہ تھا جس سے دنیا کا ہر قارون زمین میں دھنس گیا اور اس کے تمام خزانوں اور دفینوں کے دروازے ہر حاجتمند کے لئے کھل گئے۔ کہئے کہ یہ زلزلہ انگیز پیغامِ انقلاب تمام نوعِ انسانی کے لئے مایۂ رحمت تھا یا نہیں؟

آپ ان چند بھرے ہوئے عنوانات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ پیغمبر اسلام کا ظہور تمام اقوام عالم کے لئے رحمت ہے یا نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان ایک حدِ فاصل کے طور پر کھڑی ہے۔ اس مقام سے انسانیت کی تاریخ ایک نیا موڑ مڑی ہے جس سے اس کے سامنے زندگی کی جدید راہیں کھل گئی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس تیرہ سو سال میں انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں جسقدر ایسے انقلابات

آئے ہیں جن کے نتائج تعمیرِ انسانیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں، ان کا سرچشمہ وہی پیغام تھا جو محمد رسول اللہؐ کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ اس پیغام نے انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئی تعبیر عطا کی جس سے نبضِ کائنات باندازِ نو تپش آمادہ ہو گئی۔ کارلائل کے الفاظ ہیں:

> نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارے کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور ساری دنیا کو شعلہ صفت بنا گیا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ سورج کی روشنی اسی کو راستہ دکھا سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ بارش اسی کسان کی جھولی موتیوں سے بھر سکتی ہے جس نے اپنے کھیت کو سیرابی کے قابل بنا رکھا ہو۔ اسی طرح رسالتِ محمدیہؐ بھی اسی قوم کے لئے صحیح معنوں میں رحمت بن سکتی ہے جو اپنے معاشرے کو ان خطوط پر تشکیل کرے جو اس پیغامِ خداوندی نے نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے متعین کئے ہیں۔ اسی لئے دوسرے مقام پر ہے کہ رحمۃ للذین اٰمنوا منکم۔ یہ رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اس نظامِ خداوندی کو اپنا نصب العین زندگی بنائیں۔ رحمت کہتے ہیں اس قالب (Pattern) کو جس کے اندر کوئی شے اپنی تکمیل کو پہنچے۔ انسان کی صلاحیتیں صرف اس قالب کے اندر اپنی کامل نشوونما حاصل کر سکتی ہیں جو آئینِ خداوندی کی حدود سے تشکیل ہوتا ہے۔ جب انسانی ہیئت اجتماعیہ اس نظام کے قالب میں ڈھل جائے گی اس وقت انسان دیکھے گا کہ رسالتِ محمدیہؐ کس طرح فی الواقعہ رحمۃ اللعالمین ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں

مُلّا کا بہشت

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است　　بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است
بگو "عجمی" مسلماں را کہ خوش باش　　بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

اسلام ایک تحریک تھی۔ تحریک اسی وقت تک تحریک رہتی ہے جب تک اس میں حرکت رہے۔ حرکت نام ہے جدوجہد کا جسے قرآن کی اصطلاح میں جہاد کہتے ہیں۔ جدوجہد کی قدر و قیمت اس نصب العین کی نسبت سے متعین ہوتی ہے جس کے حصول کے لئے وہ جدوجہد عمل میں آئے۔ اسلام کے سامنے ایک ایسا بلند نصب العین تھا جس کے مقابلے میں دنیا کا ہر نصب العین ہیچ ہے۔ یہ نصب العین تھا تمام دنیا میں ایک ایسا نظامِ عدل و احسان قائم کرنا جس میں ہر فردِ انسانی کے تمام مضمر جوہروں کی کامل نشوونما ہو سکے۔ اسی کا دوسرا نام ہے قرآنی نظامِ حکومت جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے نہیں جھکتا، نہ کوئی کسی کا دست نگر ہوتا ہے۔ اس میں تمام اقتدارات و اختیارات صرف خدا کے قانون کے لئے ہوتے ہیں۔ والملک یومئذ اللہ۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے نصب العین کے حصول کے لئے جدوجہد بھی اتنی ہی بڑی ہوگی۔ اس لئے جو قوم اس نصب العین کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے گی اس کی ساری زندگی، مسلسل سعی و عمل اور متواتر تگ و تاز کی زندگی ہوگی۔ قرآن، اس قوم کا نام جماعتِ مومنین (یا امت وسطیٰ) رکھتا ہے ان کے اس بلند و بالا نصب العین کو ایمان سے تعبیر کرتا ہے اور اس کے حصول کے لئے پیہم جدوجہد کو اعمالِ صالحات کے نام سے پکارتا ہے۔ ان سب کا نتیجہ، اس کے نزدیک ہے جنت۔ دنیا میں بھی جنت کی زندگی اور اس کے بعد بھی جنت۔ ظاہر ہے کہ جنت کی راہ پھولوں کی سیج نہیں۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

اس راہ میں بڑی بڑی صبر آزما گھاٹیاں آتی ہیں۔ چونکہ دنیا بھر کی مستبد قوتیں اس نظامِ عدل و ربوبیت کے قیام میں اپنی سیادت و قیادت کا خاتمہ دیکھتی ہیں اس لئے وہ ہر ممکن طریق سے اس کے قیام و استحکام کی مخالفت کے لئے پورے ساز و سامان کے ساتھ مقابلے کے میدان میں اتر آتی ہیں۔ لہٰذا جنت کی راہ، باطل کی ان تمام قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ سے شروع ہوتی ہے اور آگ اور خون کے دریاؤں میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے ان لوگوں سے، جو اس راہ پر چلنے کے لئے آمادگی ظاہر کرتے ہیں کھلے کھلے الفاظ میں کہدیا کہ وہ اپنے اس فیصلے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ کیا فیصلہ کر رہے ہیں۔ یہ پوجا پاٹ اور بھگتی یا پرستش کی راہ نہیں کہ گوشۂ عافیت میں بیٹھے، گیان دھیان میں مگن ہیں اور اس خوش فہمی میں مست کہ وہ جنت کے حقدار بن رہے ہیں۔

اس جنت کے حصول کے لئے تو مفاد پرست گروہوں کے ہجوم کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ انہی مشکلوں اور سختیوں سے یہ نظام[1] پہلے قائم ہوا تھا اور اسی طرح سے اب قائم ہوگا۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم، مستہم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین آمنوا معہ متی نصر اللہ، الا ان نصر اللہ قریب۔ (۲/۲۱۴)

کیا تمہارا اندازہ یہ ہے کہ تم اس جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے؟ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ تمہیں بھی انہی مراحل سے گذرنا ہوگا جن مراحل سے وہ لوگ گذرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اس قسم کے انقلاب کی کوشش کی۔ مخالفتوں کے ہجوم سے ان لوگوں کی حالت یہ ہوگئی کہ سختیوں اور مصیبتوں نے انھیں ہر طرف سے گھیر لیا اور وہ گھبرا اٹھے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہماری کوششوں کی بار آوری کا وقت کب آئے گا؟ تب کہیں جا کر ان کی کوششیں ثمر بار ہوئیں۔

دوسری جگہ ہے۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصابرین۔ (۳/۱۴۲)

کیا تمہارا خیال ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم نے اپنے اعمال و کردار سے یہ ثابت ہی نہیں کیا کہ تم میں سے کون کسقدر سعی و عمل کا مالک ہے اور کون کس قدر استقامت کا حامل۔

یہ تھی وہ جنت جس کا وعدہ قرآن نے کیا تھا۔ یعنی خالص سعی و عمل کا نتیجہ (جزاء بما کانوا تعملون)۔ وہ جنت جو مومن کے خونِ جگر میں پوشیدہ تھی۔

مجاہدین کی جماعت، محمد رسول اللہ کی قیادت میں، شمشیر اور قرآن کو ہاتھ میں لیکر اٹھی اور اس نظامِ ربوبیت کی تشکیل (یعنی اس جنت کے حصول) کی راہ میں جو قوت بھی حائل ہوئی اسے گردِ راہ بنا کر رکھدیا۔ اس زمانے کی مہذب دنیا میں ایک طرف عیسائیوں کی (بازنطینی) سلطنت تھی اور دوسری طرف ایرانیوں کی حکومتِ کسروی۔ ان کے ساتھ ساتھ یہودیوں کی مذہبی سیادت تھی جو استبداد اور خون آشامی میں ان "دنیاوی" سلطنتوں سے کسی صورت میں کم نہ تھی۔ یہی قوتیں تھیں جو قرآنی انقلاب کے مقابلے میں آئیں اور بری طرح سے پسپا ہوئیں۔ یہ قومیں میدانِ جنگ میں تو شکست کھا گئیں لیکن انھوں نے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو اپنے سینے کے آتشکدوں میں سلگتے رکھا۔ جب مسلمانوں کی مرکزیت ذرا کمزور ہوئی تو یہ شکست خوردہ قوتیں اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکلیں تاکہ اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کریں۔ اس کے لئے انھوں نے حربہ کیا استعمال کیا؟ قرآن نے اسے نہایت لطیف پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

---

[1] اس نظام کی تشریح کے لئے اس آیت سے پہلی آیت دیکھئے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق نظام سے مقصود تمام نوعِ انسانی کو امت واحدہ بنانا ہے۔ لیکن اپنے اپنے مفاد کی خاطر اختلافات کرنے والے لوگ اس نظام کی تشکیل کی راہ میں حائل ہوں گے۔ یہی وہ مفاد پرست ہیں جن سے اس راہ میں قدم قدم پر مقابلہ ہوگا۔

وقالت طائفۃ من اھل الکتاب اٰمنوا بالذی انزل علی الذین اٰمنوا وجہ النھار واکفروا اٰخرہ لعلھم یرجعون۔ (۳/۷۲)

اہل کتاب کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یوں کرو کہ مسلمانوں میں جا کر مل جاؤ۔ صبح کے وقت ان کے قرآن پر ایمان لے آؤ (دن بھر ان میں اپنے خیالات پھیلاتے رہو) شام کو اس سے انکار کر دو۔ شاید اس طرح ان میں سے کچھ لوگ تمہارے ساتھ واپس آجائیں۔

یعنی حربہ یہ استعمال کرو کہ مسلمان بن کر ان میں جا گھسو اور چپکے چپکے اپنے خیالات کو پھیلاتے رہو حتیٰ کہ ان کے دین کا ڈھانچہ تو ان کا رہ جائے اور روح اس میں یکسر تمہارے خیالات کی حلول کر جائے۔ لعلھم یرجعون۔ انھیں ان کے دین سے پھرانے کا یہی کامیاب طریقہ ہے۔ چنانچہ وہ آئے اور نہایت مقدس لبادوں میں ملبوس ہو کر مسلمانوں کے اندر گھل مل گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز اس مجاہدانہ تگ و تاز میں ہے جس میں وہ "حصولِ جنت" کی خاطر ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ وہ اسی مجاہدانہ سعی و عمل کے زخم خوردہ تھے، اس لئے ان کی سازش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اس مجاہدانہ حرارت سے محروم کر دیا جائے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مسلمانوں کی یہ تمام تگ و تاز "حصولِ جنت" کے لئے تھی اس لئے ان سازش کرنے والوں نے سوچا کہ اگر انھیں جنت حاصل کرنے کے سہل سے طریقے بتا دیئے جائیں تو رفتہ رفتہ ان کی مجاہدانہ روح خود بخود سلب ہو جائے گی۔ اس مقصد کے لئے روایات سازی کا دروازہ کھلا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایسی ایسی احادیث وضع کیں جن سے گھر بیٹھے بٹھائے جنت مل جاتی تھی۔ چونکہ ان احادیث کو منسوب کر دیا جاتا تھا حضور رسالتمآبؐ کی ذات گرامی کی طرف، اس لئے ان کا اثر یقینی تھا۔ اس طرح یہ روایات پھیلائی گئیں اور تھوڑے سے عرصہ کے بعد آسمان کی آنکھ نے دیکھا کہ وہی قوم جس نے قیصر و کسریٰ کی قوتوں کا تختہ الٹ دیا تھا، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ اور اس طرح

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

یہی ہیں وہ روایات جنھیں ہمارے علمائے کرام، اقوال رسول اللہؐ سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ وہ خود بھی کتنے بڑے فریب میں مبتلا ہیں اور قوم کو بھی کتنے بڑے دھوکے میں رکھ رہے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو چند ایک نمونے دکھائیں ان "احادیث مقدسہ" کے جو حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں محفوظ ہیں اور جو مُلا کی غلط انگہی اور کوتاہ اندیشی سے ہمارے دین کا جزو بن رہی ہیں۔ دیکھئے کہ ان احادیث کی رو سے، وہی جنت جس کے حصول کا قرآنی طریقہ اوپر مذکور ہے کتنے سستے داموں ہاتھ آجاتی ہے۔ حصولِ جنت کے ان طریقوں کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ جس قوم کو اس طرح سے جنت مل جائے اس میں قوتِ عمل کا کوئی شائبہ بھی باقی رہ سکتا ہے؟

لیجئے اب روایات کی رو سے جنت کے ٹکٹ خریدیئے۔ دیکھئے کتنی سستی جا رہی ہے۔

مصافحہ سب سے پہلے سلام علیکم کیجئے اور ہاتھ ملایئے۔ لیجئے! جنت مل گئی۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ انھیں بخش دیتا ہے۔

اب مسجد میں چلئے اور وضو کیجئے۔ جنت حاضر ہے۔

وضو سے جنّت

مسلم کی حدیث ہے کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ ٹپک جاتے ہیں یہانتک کہ پانی کا آخری قطرہ ہر عضو کے آخری گناہ کو ساتھ لیکر ٹپکتا ہے۔

مسلم ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ جو شخص پورا پورا وضو کرتا ہے اور وضو کے بعد نماز پڑھتا ہے اور نماز بھی اچھی طرح ادا کرتا ہے تو نماز کے بعد بالکل ایسا ہو جاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے۔

تیسری حدیث میں ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے اور وضو کے بعد یہ کلمات کہتا ہے کہ "اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ" تو ایسے شخص کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ (مسلم)

ابن خزیمہ کی روایت ہے کہ نبیٔ اکرمؐ نے حضرت بلالؓ سے دریافت کیا کہ تم کیا عمل کرتے ہو؟ میں نے تمہاری جوتیوں کی آواز جنت میں سنی کہ تم مجھ سے بھی آگے آگے چل رہے ہو۔ بلالؓ نے عرض کیا کہ دو کام میرے معمول بہا ہیں۔ ایک ہمیشہ باوضو رہتا ہوں۔ جب وضو ٹوٹ جاتا ہے تو فوراً دوسرا وضو کر لیتا ہوں۔ اور جب وضو کرتا ہوں تو دو رکعتیں نفل ادا کر لیا کرتا ہوں۔

کہئے؟ کس قدر سستی رہی جنت! وضو کیا تو تمام گناہ اس کے پانی میں بہہ گئے۔ اور اگر ساتھ دو رکعتیں نفل بھی پڑھ لئے تو خود رسول اللہؐ سے بھی آگے آگے جنت میں پہنچ گئے۔

اس سے بھی آسان

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص موذن کے جواب میں اذان کے الفاظ دہراتا ہے لیکن حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتا ہے تو یہ شخص جنت میں جائے گا۔

گناہ کئے جاؤ!

جسے قانون کی اصطلاح میں جرم کہا جاتا ہے اسے مذہب کی زبان میں گناہ کہتے ہیں۔ جرم ایک مرتبہ کا بھی کم نہیں ہوتا لیکن عادی مجرم کے لئے تو سوسائٹی میں کوئی جگہ ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس، مُلّا کے مذہب نے جرائم کے لئے ایسا لائسنس دے رکھا ہے کہ صبح سے شام تک جرم پر جرم کئے جاؤ لیکن ساتھ نمازیں بھی پڑھتے جاؤ۔ سب جرم معاف ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ طبرانی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم جلتے رہتے ہو یعنی آگ کے کام کرتے رہتے ہو لیکن جب صبح کی نماز پڑھ لیتے ہو تو وہ تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ یعنی دوزخ سے دور کر دیتی ہے پھر ظہر تک وہی کام کرتے ہو لیکن ظہر کی نماز تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ پھر عصر تک وہی کام کرتے ہو لیکن عصر کی نماز ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشا کی نمازیں اپنے درمیانی اوقات کے گناہوں کو مٹا کر تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔ جب تم سو رہتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا یہانتک کہ نیند سے جاگو (اور اگر رات کو دوزخ کے کام کرتے رہو تو صبح کی نماز انہیں ٹھنڈا کر دے گی۔)

باجماعت نماز

ترمذی کی حدیث ہے کہ چالیس دن تک تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنے والا دوزخ اور نفاق دونوں سے بری کر دیا جاتا ہے۔

لیجئے! ایک چلّہ پورا کر لیجئے اور عمر بھر کے لئے جو جی میں آئے کیجئے۔ دوزخ میں آپ کبھی نہیں جا سکتے۔

اور رعایت

اور اگر چالیس دن کی نماز باجماعت بھی آپ پر گراں گزرتی ہے تو اس رعایت سے فائدہ اٹھائیے۔ بخاری اور مسلم

دونوں میں ہے کہ جب امام سورۂ فاتحہ ختم کرتا ہے اور ولا الضالین کہتا ہے تو فرشتے آمین کہتے ہیں۔ مقتدیوں میں سے جس شخص کی آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ ادا ہوئی اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

بخاری اور امام مالکؒ کی ایک حدیث میں ہے کہ جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر رکوع سے سر اٹھائے تو تم ربنا لک الحمد کہا کرو۔ جو بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

مستقل الاٹمنٹ یہاں تو صرف گناہ بخشے جانے کا ذکر تھا۔ مسلم کی ایک حدیث ہے کہ جو شخص علاوہ فرض کے، دن رات میں بارہ رکعتیں پڑھ لے اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ترمذی کی روایت ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد بیس رکعت نفل پڑھنے والے کیلئے جنت میں گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ابوداؤد میں ہے کہ ظہر کے فرضوں سے پہلے جو شخص چار رکعتیں پڑھتا ہے اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔

ساتھ رونگا بھی! مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے جمعہ کے لئے آیا اور خاموش بیٹھکر خطبہ سنا تو اس کے گناہ نہ صرف جمعہ سے جمعہ تک بخش دیئے جاتے ہیں بلکہ تین دن کے اور زائد گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔ (یہ رونگا ہے)

وظائف سے جنت وظائف، عجمی اسلام کا امتیاز خصوصی ہیں۔ "دین اور دنیا" کا کوئی معاملہ پیش آجائے، اس کے لئے نہ کسی محنت کی ضرورت ہے نہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی حاجت۔ بس ایک وظیفہ پڑھ لیجئے، مطلب حل ہو جائے گا۔ لیجئے۔ اب حصولِ جنت کے دو چار وظائف بھی سن لیجئے۔ نسائی کی حدیث ہے کہ جس نے صبح اور مغرب کی نماز کے بعد سات مرتبہ اللھم اجرنی من النار (یا اللہ مجھے دوزخ سے نجات دے) پڑھ لیا تو دن اور رات میں کسی وقت بھی مر جائے وہ جنت میں جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے والا اگر دوسری نماز کے وقت سے پہلے مر جائے تو جنت میں جائے گا۔

ترمذی میں ہے کہ جس نے بستر پر لیٹتے وقت کہا استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ۔ اس کے تمام گناہ بخشدیئے گئے۔ وہ گناہ خواہ دریاؤں کی جھاگ کے برابر ہوں یا درختوں کے پتوں کے برابر، ریگ کے ذروں کے برابر ہوں یا ان کی تعداد ایام دنیا کی مثل ہو۔ یعنی ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جتنے دن ہوں ان کی مثل بھی گناہ ہوں تو سب بخش دیئے جائیں گے۔

مسلم میں ہے کہ ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔ یہ ننانوے ہوئے۔ آخری کلمہ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحیی ویمیت بیدہ الخیر وھو علی کل شی قدیر۔ پڑھ کر سو کا عدد پورا کر لیا کرو۔ جس نے یہ وظیفہ پڑھا اس کے تمام گناہ بخشدیئے جاتے ہیں اگرچہ کتنے ہی زائد کیوں نہ ہوں۔

ترمذی میں ہے کہ جس نے ہر دن میں سو بار قل ہو اللہ پڑھنے کا ورد کر لیا تو اس کے پچاس سالہ گناہ مٹ گئے۔

مسند امام احمدؒ میں ہے کہ حضرت ام ہانیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ہلکا سا وظیفہ بتا دیجئے کیونکہ میں بہت بڑھیا ہو گئی ہوں آپ نے فرمایا کہ سبحان اللہ سو بار پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو غلام آزاد کئے اور یہ غلام بھی حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے۔ سو بار الحمد للہ پڑھا کرو، اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو گھوڑے زین اور لگام سمیت مجاہدین کو دیدیئے۔ سو بار اللہ اکبر کہا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو اونٹ معہ نکیل وغیرہ کے اللہ کے راستے میں دیئے۔ اور سو بار لا الہ الا اللہ کہا کرو۔ یہ کلمہ زمین و آسمان کو ثواب سے بھر دیتا ہے۔ جس دن یہ وظیفہ پڑھے گی اس دن کسی کے اعمال بھی تیرے اعمال کے برابر آسمان پر نہ جائیں گے۔ ہاں اگر کوئی دوسرا بھی یہ وظیفہ پڑھے تو اس کے اعمال بیشک تیرے اعمال کے برابر ہوں گے۔

حاکم کی روایت ہے کہ جس نے اپنی بیماری میں چالیس مرتبہ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین پڑھا اور پھر اسی بیماری میں مر گیا تو اس کو ایک شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اور اگر اس بیماری سے اچھا ہو گیا تو تمام گناہوں سے پاک ہو کر اچھا ہوتا ہے۔

شہادت

قرآنی نظام کے قیام کی جدوجہد میں ہر قربانی اپنی جگہ وزن رکھتی ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ گراں بہا قربانی، انسان کی جان کی قربانی ہے۔ قرآن نے ان سعادت مند نفوس کو "مقتول فی سبیل اللہ" (اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے) کہکر پکارا ہے۔ انھیں عام طور پر شہید کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی اعمال میں شہادت کا مرتبہ بہت بلند ہے اور مخالفین کے لئے "اللہ کی راہ میں لڑنے والوں" سے بڑھ کر خطرناک اور کوئی نہیں۔ یہی مجاہدین اور مقتولین فی سبیل اللہ تھے جنھوں نے باطل کی قوتوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ اس لئے ان قوتوں کو دوبارہ ابھرنے نہ دینے کا راز اسی میں تھا کہ مسلمان کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ سے بیگانہ کر دیا جائے۔ اب دیکھئے کہ اس کے لئے عجمی سازش نے کیا کیا؟

مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو! حاضرین نے عرض کیا کہ جو خدا کی راہ میں مارا جائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح تو میری امت میں شہداء کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہے؟ فرمایا جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید۔ جو خدا کی راہ میں مر گیا وہ شہید۔ جو طاعون سے مر گیا وہ شہید۔ جو اسہال (دستوں کی بیماری) سے مر گیا وہ شہید۔ جو پانی میں ڈوب کر مر گیا وہ شہید۔ جو مکان کے گرنے سے دب کر مر جائے وہ شہید۔ (اسی طرح ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ) جو نمونیہ سے مر جائے وہ شہید۔ جو آگ میں جل کر مر جائے وہ بھی شہید۔ جو عورت وضع حمل سے مر جائے وہ بھی شہید۔

غور فرمایا آپ نے کہ شہداء کی فہرست کس طرح بڑھائی گئی ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ ان "شہداء" کو اللہ کے ہاں رعایات کیا ملتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شہید سیدھا جنت میں جاتا ہی لیکن روایات کی رو سے وہ اکیلا ہی جنت میں نہیں جاتا بلکہ جس طرح ریلوے کا ہر ملازم اپنے پاس پر اپنے خویش و اقارب کو بھی ساتھ لے جا سکتا ہے اسی طرح شہید بھی اپنے ساتھ بہت سے اقرباء کو جنت میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ شہید کو اپنے خویش و اقارب میں سے ستر آدمیوں کی شفاعت کا حق دیا جائے گا۔

دیکھئے کتنی بڑی رعایت دی ہے اس "ارحم الراحمین" نے۔ اور اس پر بھی مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ کمبخت ڈوب کر نہیں مرتے تاکہ مرنے والا خود بھی جنت میں جائے اور اپنے ساتھ ستر اقربار کو بھی فری لے جائے!

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!

غالب نے ڈوب کر مرنے کا صرف یہ فائدہ بتایا تھا کہ

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ۔۔۔ نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے اگر اس حدیث کا علم ہوتا تو ان فوائد میں اس کا بھی اضافہ کر لیتا!

مسافر کی موت

خیر! اگر آپ ڈوب کر نہیں مرنا چاہتے تو نہ سہی۔ جنت میں جانے کی اور بھی کئی راہیں ہیں۔ آپ کچھ ہی کیجئے، اللہ میاں کسی نہ کسی بہانے آپ کو جنت میں لے جا کر رہے گا۔ (معاذ اللہ) وہاں جو مکانات بنوا دیئے گئے ہیں انھیں خالی تھوڑا رکھا جائے گا؟

نسائی میں ہے کہ ایک شخص کی وفات مدینہ منورہ میں واقع ہوئی۔ حضورؐ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ کیا اچھا ہوتا اگر یہ غیر وطن میں مرتا۔ کسی نے عرض کیا، حضورؐ! سفر میں مرنے سے کیا فائدہ؟ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص سفر میں مرتا ہے تو موت کی جگہ سے لیکر اس کے وطن تک کی مسافت کے برابر جنت میں جگہ دی جاتی ہے۔

غالب نے بھی سفر میں مرنے پر خوشی منائی تھی جب اس نے کہا تھا کہ

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور ۔۔۔ رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

لیکن روایات سازی کے یہ مقدس "شعراء" غالب سے بہت آگے ہیں۔

لڑکیوں کا باپ

اولاد کے معاملے میں انسان بے بس ہے کہ اس کے ہاں لڑکے پیدا ہوں یا لڑکیاں۔ لیکن اس بے بسی میں بھی ایک رعایت کا پہلو ہے۔ حاکم کی روایت ہے کہ جس شخص کے ہاں دو لڑکیاں ہوئیں اور اس نے ان کے ساتھ بھلائی کی جب تک وہ اس کے پاس رہیں تو یہ لڑکیاں اسے جنت میں لے جائیں گی۔

یہ تو رہا اس شخص کا معاملہ جس کی اولاد زندہ رہے۔ اب آیا وہ جس کے بچے فوت ہو جائیں۔ جنت کا ٹکٹ اس کے لئے بھی ریزرو کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ صحیحین (بخاری اور مسلم) کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس مسلمان کے تین نابالغ بچے مر گئے خدائے تعالیٰ اُسے جنت میں داخل کرے گا۔

بخاری اور مسلم ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ کسی شخص کے تین بچے مر جائیں اور پھر اسے آگ چھوئے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ صرف قسم پورا کرنے کے لئے اسے صراط پر سے گذارا جائے گا!

نسائی میں ہے کہ تین بچوں کی وفات پر جنت ملنے کی بشارت سنکر ایک عورت نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ جس کے دو ہی بچے مرے ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ دو کے مرنے پر بھی یہی بشارت ہے۔ اس عورت نے بعد میں کہا، کاش میں ایک بچے کے متعلق بھی پوچھ لیتی تو

اچھا ہوتا۔

لیکن اس پر افسوس کیوں؟ اس کمی کو سنن امام احمدؒ کی ایک روایت نے پورا کر دیا۔ حضرت معاذؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے صرف ایک بچے کی وفات پر بھی جنت کی بشارت دی ہے۔ حتیٰ کہ اسقاط حمل پر بھی۔

زن مرید جس شخص کی بیوی زبردست ہو اور وہ بچارا اس کی سختیوں پر اُف تک نہ کر سکے اور بلا چون وچرا اس کے احکام کی تعمیل کرتا رہے اسے سوسائٹی میں زن مرید کہتے ہیں۔ لیکن مُلّا کے مذہب میں اس کا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو شوہر اپنی بیوی کی ایذا پر صبر کرتا ہے تو وہ جنت میں جائے گا۔

زانیہ عورت قرآن کی رو سے زنا بہت بڑا جرم ہے لیکن جب تک جنت کے ٹکٹ بانٹنے کا کام مولوی صاحب کے ہاتھ میں ہے ایسا جرم بھی معاف کر دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک زانیہ عورت نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے تڑپ رہا ہے۔ اس نے اپنا موزہ نکالا اور دوپٹے سے باندھ کر کنوئیں سے پانی نکال کر اسے پلا دیا۔ اس پر اللہ نے اسے جنت میں بھیج دیا۔

خدا کی "موج" پرانے بادشاہوں کے قصے مشہور ہیں کہ ان کا جشن دن آیا تو اتنے قیدی جیل خانے سے رہا کر دیئے اور تاجپوشی کا دن آیا تو اتنے قیدیوں کی "بند خلاصی" کی گئی۔ چنانچہ مذہب نے بھی خدا کا تصور ایک مطلق العنان بادشاہ کا پیش کیا ہے جو جس طرح جی میں آئے کرتا رہتا ہے۔ اسی بنا پر عجم کے شہنشاہ پرست راویوں نے خدا کے لئے بھی ایسی تقاریب پیدا کر دیں جن میں وہ دوزخ کے قیدیوں کو رہا کرتا رہے۔ امام بیہقی کی روایت ہے کہ رمضان کی ہر رات میں چھ لاکھ دوزخی آزاد کئے جاتے ہیں اور رمضان کی آخری شب میں تمام گذشتہ تعداد کی مثل دوزخ سے آزاد کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح مسلم میں ہے کہ عرفہ کا روزہ رکھنے سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اور محرم کی دسویں کا روزہ گذشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ابن ماجہ میں ہے کہ اس سے آئندہ ایک سال کے گناہوں کا بھی کفارہ ہو جاتا ہے۔

سانپ اور گرگٹ مارنے والا مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص گرگٹ کو پہلی ہی ضرب میں مار دے تو اس کا ثواب اس سے زیادہ ہے جو دو ضربوں میں مارے۔ اور دو ضربوں سے مارنے والے کا ثواب اس سے زیادہ ہے جو تین ضربوں سے مارے۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ اگر گھر میں سانپ نکلے تو اس سے کہدے کہ تجھے قسم ہے اس عہد کی جو تو نے حضرت نوح اور سلیمان علیہما السلام سے کیا تھا، ہم کو ایذا نہ دیجیو۔ اگر اس کے بعد بھی نکلے تو اسے مار ڈالے۔ امام احمدؒ کی مسند کے مطابق اسے سات نیکیوں کا ثواب ملے گا۔

قرآن کی تلاوت قرآن نظامِ خداوندی کا ضابطۂ قانون ہے جس کے مطابق انسانی معاشرے کی تشکیل ہونی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ قانون، عمل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کا عمل قرآن کے مطابق رہتا تو باطل کی قوتیں کبھی سر نہ اٹھا سکتیں۔ لہٰذا عجمی سازش کی پہلی تدبیر یہ تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ کر دیا جائے۔ (درحقیقت ان کی ساری سازش کا مقصود یہی

یہی تھا۔) اس کے لئے انھوں نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ قرآن فقط پڑھنے کی چیز ہے، عمل کرنے کی نہیں۔ ثواب اس کے پڑھنے سے ملتا ہے۔ جہاں قرآن کے اعمال کا ذکر ہے اس سے مراد وہ عملیات ہیں جن کی رو سے بھوت پریت دور کئے جاتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے مسلمانوں کو قرآن کے الفاظ دہرانے میں الجھا دیا۔ یعنی صرف پڑھنے میں۔ قرآن کے الفاظ دہرانے کی برکات کے متعلق تمام کتب احادیث بھری پڑی ہیں۔ نمونۃً دو ایک مثالیں سن لیجئے:۔

صحیحین کی روایت ہے کہ ایک صحابی رات کو قرآن پڑھ رہے تھے۔ گھوڑا پاس بندھا تھا۔ وہ اچھلنے لگا تو انھوں نے قرأت ختم کر دی۔ آسمان کی طرف دیکھا تو بہت سے چراغ معلوم ہوئے جو نیچے سے اوپر کو جا رہے تھے۔ صبح کو حضورؐ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا یہ فرشتے تیرا قرآن سننے آ رہے تھے۔ اگر تو پڑھے جاتا تو عجیب و غریب چیزیں دیکھتا۔

مسلم کی روایت ہے کہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں دو نور ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو عطا نہیں ہوئے۔ جو کوئی ایک حرف بھی ان کا پڑھے گا اس کو وہ نور دیا جائے گا۔

مستدرک حاکم میں ہے کہ آیت الکرسی جس گھر میں پڑھی جاتی ہے اس گھر سے شیطان نکل بھاگتا ہے۔

ترمذی میں ہے کہ اگر سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں کسی جنگل میں تین دن رات تک پڑھی جائیں تو پھر وہاں شیطان کا اثر نہیں ہوتا۔

نسائی میں ہے کہ سورۂ یٰسین قرآن کا دل ہے۔ جو بندہ اس کو رضائے الٰہی اور دار آخرت کے لئے پڑھتا ہے وہ بخشا جاتا ہے۔ تم اسے اپنے مُردوں پر پڑھا کرو۔

ترمذی میں ہے کہ جو شخص سورۂ یٰسین کو ایک دفعہ پڑھ لیتا ہے اسے دس بار قرآن پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔

موطا امام مالکؒ میں ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کو قل ہو اللہ احد پڑھتے ہوئے سن کر فرمایا کہ اس پر واجب ہو گئی۔ کسی نے دریافت کیا کہ کیا واجب ہو گئی۔ فرمایا جنت واجب ہو گئی۔

حاکم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خوش آواز قرآں خواں کی آواز کو نہایت شوق سے سنتا ہے جیسے کوئی گانا سننے والا گانے والے کی آواز کو شوق سے سنتا ہے۔

جنّت ضعیفوں اور کمزوروں کیلئے ہے

باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے حق کے پاس ان قوتوں سے بڑھ کر قوت ہونی چاہئے اس لئے اسلام غلبہ اور قوت کا دین ہے۔ فان حزب اللہ ھم الغالبون۔ (غلبہ اور تمکن اللہ کے لشکر کے لئے ہے)۔ قرآن بار بار مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے پاس اتنی قوت جمع رکھو کہ اس سے مخالفین کے دل پر تمہارا رعب چھایا رہے۔ جماعتِ مومنین کی قوت ہی تھی جس نے قیصر و کسریٰ کی شوکت و سطوت کو غبار راہ بنا دیا تھا۔ اس لئے مخالفین یہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے دل سے یہ خیال نہ نکال دیا جائے کہ قوت و سطوت خدا کے ہاں برگزیدگی کا موجب ہے ان پر غالب آنا ناممکن ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس قسم کی احادیث وضع کرنی شروع کر دیں کہ خدا کے مقرب بندے وہ ہیں جو ضعیف و ناتواں ہیں جن پر محتاجی اور مفلسی چھائی رہتی ہے۔ جو کمزوری اور بے چارگی کے مجسمے ہیں۔ جو دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔ چنانچہ بخاری اور

مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا کہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں فقیر تھے۔

طبرانی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میرا حوض بہت لمبا چوڑا ہے۔ اس کے آب خوروں کی تعداد اتنی ہے جتنے آسمان کے تارے۔ اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ جو لوگ سب سے زیادہ اس حوض پر آئیں گے وہ فقرائے مہاجرین ہونگے۔ کسی نے عرض کیا ان کا حال بیان فرمائیے وہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا یہی لوگ جن کے بال پریشاں، کپڑے میلے کچیلے، اونچے درجے کے لوگ انھیں اپنی بیٹی نہیں دیتے۔ کوئی ان کے پاس پھٹکنے کا روادار نہیں۔ ان پر کسی کا حق ہو تو وہ چھاتی پر چڑھ کر لے لے اور اگر ان کا کسی پر حق ہو تو یہ بچارے اپنی کمزوری کے باعث کچھ نہ کر سکیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ خدا کے مقربین کا کیا حلیہ بیان ہو رہا ہے؟ ژولیدہ مو۔ پریشان حال۔ بوسیدہ اور میلا کچیلا لباس۔ کوئی انھیں اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیتا۔ کمزوری اور ناتوانی کا یہ عالم کہ بالادست ان کا حق دبا کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ بچارے سوائے آہ بھر کر رہ جانے کے کچھ نہیں کر سکتے!

یہ ہیں مقربینِ بارگاہ خداوندی جن کے لئے عجمی سازش نے جنت مخصوص کر دی ہے!

ترمذی میں ہے کہ فقراء اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔

ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہؐ کو مسکنت اور مساکین اس قدر محبوب تھے کہ آپ دعا مانگا کرتے تھے کہ اللھم احیینی مسکینا وتوفنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین (یا اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ مسکین ہی مارا اور میرا حشر بھی مسکینوں کے ساتھ کر)

یہ وہ مسکنت ہے جسے قرآن نے خدا کا عذاب بتایا ہے۔ جب یہودیوں کے متعلق کہا کہ وضربت علیہم الذلۃ والمسکنت...

بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں اہل جنت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کمزور اور حقیر اور ضعیف مسلمان جنتی ہیں۔ اگر اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو ضرور سچا کر دے۔

طبرانی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت میں وہ لوگ بھی ہیں کہ اگر وہ تم سے ایک پیسہ مانگیں تو تم انھیں نہ دو لیکن اگر اللہ سے جنت مانگیں تو اللہ انھیں جنت دیدے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے کپڑے میلے کچیلے، بال پریشاں، مفلسی کے مارے بالکل شکستہ حال لیکن اگر خدا پر قسم کھا بیٹھیں تو خدا ان کی قسم کو پورا کر دے۔

مفلسی، تنگدستی، پریشاں حالی، بیچارگی، ناتوانی، غرضیکہ محکومیت اور محتاجی کی تمام لعنتیں مسلمانوں کے لئے صفاتِ حسنہ بنا دی گئیں۔ اور یہ چیز ان کے ذہن میں راسخ کر دی گئی کہ مصیبتیں اور پریشانیاں گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ

مصیبتیں گناہ کا کفارہ بن جاتی ہیں

مسند امام احمد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب کسی بندے کے گناہ بہت ہو جاتے ہیں اور کوئی عمل ایسا نہیں ہوتا جن سے گناہوں کا کفارہ ہو سکے تو اللہ تعالیٰ اسکو رنج و مصائب میں مبتلا کرتا ہے اور یہ مصائب اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔

حتیٰ کہ بیماری بھی!

طبرانی میں ہے کہ جب کوئی مومن بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں سے ایسا پاک کر دیتا ہے جیسے

بھٹی لوہے کو زنگ اور میل کچیل سے پاک وصاف کر دیتی ہے۔

بخاری میں ہے کہ جب بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ بیماری اور سفر سے اس بندے کے اعمال میں جو کمی ہو رہی ہے اسے پورا لکھتے جاؤ۔

مسند امام احمد میں ہے کہ بیمار کی خطائیں اس طرح گر جاتی ہیں جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے گر جاتے ہیں۔ مومن اگر تندرست ہو جاتا ہے تو گناہوں سے پاک ہو کر تندرست ہوتا ہے اور اگر مر جاتا ہے تو مرحوم و مغفور ہو کر مرتا ہے۔

کیا عمدہ سودا ہے! حسرت موہانی نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ

صحتیں لاکھوں میری بیماریٔ غم پر نثار جس میں لوٹے بارہا ان کی عیادت کے مزے

لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ بیماری میں چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی ہوتی ہے۔ اگر تندرست ہو گئے تو تمام سابقہ گناہ معاف اور اگر مر گئے تو سیدھے جنت میں۔

بخار سے جنت ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ بخار اور دردِ سر سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ خواہ یہ گناہ احد کے پہاڑ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں (ابو یعلیٰ)۔ حتیٰ کہ "ایک دن کا بخار بھی مومن کے تمام گناہوں کو دور کر دیتا ہے" (ابن ابی الدنیا)

جب ایک دن کا بخار بیمار کے تمام گناہوں کو دور کر دیتا ہے تو چالیس دن کا ٹائیفائڈ یا برس دن کا تپ دق تو سارے شہر کے گناہ دور کر دیتا ہوگا!

اندھا اور اندھا تو آنکھ بند کئے سیدھا جنت میں جا پہنچتا ہے۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ جب اللہ کسی بندے کی آنکھیں لے لیتا ہے تو اسے اس کے بدلے میں جنت دے دیتا ہے۔

خلوت گزینی قرآن نے جماعتِ مومنین کے متعلق فرمایا تھا کہ ہم نے انھیں امت وسطیٰ بنایا ہے لتکونوا شھداء علی الناس تاکہ یہ تمام نوع انسان کے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور جو ذرا بھی عدل کے راستے سے ہٹنے لگے سے فوراً سیدھی راہ پر لے آئیں۔ لیکن عجمی سازش نے آکر بتایا کہ خدا کے مقرب وہ ہیں جو گھروں کے اندر خلوت میں بیٹھے رہتے اور اپنی خطاؤں پر روتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ترمذی میں ہے کہ کسی نے حضورؐ سے پوچھا کہ نجات کس میں ہے۔ فرمایا کہ اپنی زبان کو بند رکھ، اپنی خطاؤں پر رو اور گھر میں بیٹھ رہ۔

ابوداؤد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ وقت آئیگا کہ لوگوں میں وعدہ اور اقرار کا وزن گھٹ جائے گا۔ امانت کی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔ انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر حاضرین کو بتایا کہ فتنے اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائیں گے جس طرح بوریا بُنا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ ایسے وقت میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فرمایا اپنے گھر میں بیٹھ جا اور اپنی جان پر رویا کر۔ نیکی کو اختیار کر، بدی کو چھوڑ۔ اپنی جان کو دوزخ سے بچا اور پبلک زندگی سے علیحدہ ہو جا۔

اور باطل کی قوتوں کو کھلا چھوڑ دے کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کریں۔ بلکہ یہاں تک بھی کہہ دیا کہ شہروں کو چھوڑ کر

جنگل میں چلے جانا چاہیئے کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ جماعت کی نماز کا ثواب پچیس نمازوں کے برابر ہے۔ لیکن جنگل میں لوگوں سے علیحدہ ہو کر نماز ادا کرنے کا ثواب پچاس نمازوں کے برابر ہے۔ (ابوداؤد)۔

یہ وہی رہبانیت کی زندگی ہے جسے مٹانے کیلئے قرآن آیا تھا۔ یعنی یا تو جنگلوں میں چلے جاؤ اور اگر شہر میں رہو تو اپنے اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے رہو اور "خدا کے خوف سے روتے رہو"۔ چنانچہ بیہقی کی روایت ہے کہ ایک دن حضورؐ وعظ فرما رہے تھے۔ ایک شخص وعظ میں رونے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے پاس بیٹھنے والے بھی سب بخش دیئے گئے خواہ ان کے گناہ مثل پہاڑ کے بھی کیوں نہ ہوں۔ اسی میں ایک انصاری کا واقعہ لکھا ہے کہ اس پر خدا کا خوف اس قدر غالب آگیا کہ ہر وقت رویا کرتا تھا۔ حضورؐ نے جب اس کا ذکر سنا تو اس کے مکان پر تشریف لے گئے اور جا کر اسے گلے سے لگایا۔ انصاری پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مر کر گر پڑا۔ (بیہقی)۔

یہ ان مجاہدین کی کیفیات بیان ہو رہی ہیں جن کی زندگی قرآن نے یہ بتائی تھی کہ یقاتلون فی سبیل اللہ ویقتلون و یُقتلون۔ کہ وہ اللہ کی راہ میں، باطل کی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوتے ہیں۔ پھر میدانِ جنگ سے یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا وہیں جان دیدیتے ہیں۔ غور فرمایا آپ نے کہ اس طرح کی شمشیر برہنہ قوم کو کس طرح خانقاہوں کے راہب بنا کر رکھ دیا؟

جنازے سے جنت

یہانتک تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا جس سے جنت ملتی تھی۔ اور نہیں تو کوئی ورد وظیفہ ہی سہی۔ لیکن اب اس سے بھی آگے بڑھئے۔ مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر کسی میت کی نماز میں چالیس آدمی شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ جس میت پر مسلمانوں کی تین صفین نماز پڑھتی ہیں اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔ اور بخاری میں ہے کہ اگر کسی میت کو چار یا تین یا دو آدمی بھی اچھا کہدیں تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔

اور اگر یہ بھی نہ ہو تو . . .

اور بفرضِ محال اتنا بھی نہ ہو اور مردے کو کشاں کشاں دوزخ تک لے جائیں تو کیا وہاں سے بھی چھٹکارے کی کوئی صورت ہے؟ ہے کیوں نہیں! بیہقی کی روایت ہے کہ ایک بندے کو ارشاد ہوگا آگ میں داخل ہو جا۔ وہ دوزخ کے کنارے پہنچکر ادھر اُدھر دیکھنے لگے گا اور کہے گا کہ خدا کی قسم مجھے خدا سے اچھی امید اور بھلائی کا گمان تھا۔ ارشاد ہوگا۔ اسے لوٹا لاؤ۔ میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں۔

مختصراً یہ ہیں طریقے اس جنت کو حاصل کرنے کے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ اس کی راہ میں ایسے جانگداز مراحل آتے ہیں کہ اور تو اور، خود رسول اور اس کے رفقائے کار گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ یہ جنت نتیجہ تھی اس انقلابِ عظیم کا جس کی رو سے دنیا کے ہر مفاد پرست گروہ کے ہاتھوں سے اقتدار چھن کر تمام اختیارات قانونِ خداوندی کے ہاتھ میں آجاتے تھے اور خدا کی طرف سے عطا فرمودہ رزق کے چشمے خدا کے بندوں کے لئے عام ہو جاتے تھے۔ اس انقلاب میں

نہ قیصر کی شوکت باقی رہتی تھی نہ کسریٰ کی سطوت۔ نہ نظامِ خانقاہیت کی روباہ بازیوں کو اذنِ فریب دہی مل سکتا تھا، نہ احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو اپنی سیادت و قیادت قائم کرنے کی اجازت۔ یہ نظام ان تمام مفاد پرست جماعتوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا اس لئے انھوں نے جب میدانِ جنگ میں شکست کھائی تو مذہب کا نقاب اوڑھ کر مسلمانوں کی صفوں میں آگھسے اور روایات کے پردے میں، اس نظام کے ہر عنصر کو نگاہوں سے اوجھل کر کے مسلمانوں کو مذہب کی توہم پرستیوں میں الجھا دیا۔ اب یہی "مذہب" ہے جس کا محافظ ہمارا مُلّا ہے۔ یعنی عجم کی سازش کا مستقل پاسبان۔ یہ سازش روایات کے آسرے پر پروان چڑھی اور انہی کے سہارے پر آج تک قائم ہے۔ انہی روایات کے متعلق سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ "قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ ہیں" (مثلہٗ معہٗ)۔ ہو سکتا تھا کہ فریب خوردگانِ "مذہب" میں سے کسی کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ ہم اس جھوٹ کو کس طرح آگے بڑھاتے چلے جائیں۔ لیکن اس خدشہ کا علاج بھی پہلے ہی سوچ لیا گیا تھا۔ اس کے لئے یہ عقیدہ پیدا کر دیا گیا کہ نیک کام کے لئے جھوٹ بولنے میں بھی گناہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے (معاذ اللہ) فرمایا کہ

(مسلمانوں میں صلح کرانے کی غرض سے اگر کچھ جھوٹ بھی بول دیا جائے تو جھوٹ کا گناہ نہیں ہوتا۔ (ابوداؤد)

جب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تو ہر "نیک کام" کے لئے جھوٹ بولنا جائز قرار پا گیا۔[1] اب کون بتا سکتا ہے کہ ایمانی جھوٹ کے اس انبار میں کتنا حصہ ابتدائی سازش والوں کا ہے اور کتنا حصہ ان کا جنھوں نے "نیک مقصد" کی خاطر روایات کو وضع کیا۔ نوح ابن ابی مریم نے قرآن کی ایک ایک سورت کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں جن کو مفسرین (بالخصوص بیضاوی) نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔ جب ان پر جرح کی گئی تو انھوں نے اقرار کیا کہ میں نے یہ حدیثیں خود بنائی ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔ ابن جوزی کا بیان ہے کہ بہت سے عابد اور زاہد ایسے تھے جو لوگوں کو اچھے کاموں کی رغبت دلانے کے لئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ یہ تو وہ جھوٹ تھا جو ابوداؤد کی روایت کے مطابق نیک کاموں کے لئے بولا گیا۔ باقی رہا وہ جھوٹ جو خالص سازش کے ماتحت افترا کیا گیا سو اس کا ٹھکانہ ہی کیا۔ شیخ محمد طاہر گجراتی تذکرۃ الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ جب ابن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے لے گئے تو اس نے کہا کہ "میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتا رہا ہوں۔" بہرحال جھوٹ پہلی سازش کے ماتحت بولا گیا یا بعد میں "اہلیانِ مسجد" نے "نیک کاموں" کے لئے اس جھوٹ کی حمایت کی، نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ یعنی یہ جھوٹ مسلمانوں کا مذہب بن گیا۔ وحی غیر متلو اس کا نام رکھ کر اسے قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ٹھہرا دیا گیا۔ نہیں! بلکہ اسے قرآن کا ناسخ قرار دیدیا گیا اور اس طرح مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ بنا کر ایک انقلاب آفریں امت کو قبرستانوں کے حافظ بنا کر رکھ دیا۔

ان امور کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ صورتِ حالات کیا ہے؟ مُلّا سے اس بارے میں کچھ کہنا بے سود ہے اس لئے کہ یہ ساری عجمی سازش (دانستہ یا نادانستہ) اسی کے آسرے پر بڑھی، پھولی، پھلی اور اب اسی کے ذریعے قائم ہے۔ وہ اسے قائم رکھنے کے لئے

---

[1] میکیاؤلی (Machiavelli) جو مغرب کی ابلیسی سیاست کا امام ہے۔ اسی عقیدہ کا علمبردار ہے کہ حصولِ مقصد کے لئے جو ذریعہ بھی اختیار کیا جائے، جائز ہوتا ہے۔

ہر ممکن کوشش کریگا۔ سوال اس طبقے سے ہے جو معاملات پر غور و فکر کر سکتا ہے کہ یہ لغویات جنہیں عجمی سازش نے "مذہب" کا نام دے رکھا ہے بالآخر کب تک برداشت کی جائیں گی۔ ان کی وجہ سے ساری دنیا میں اسلام بدنام ہو رہا ہے۔ ہر جگہ مسلمان ذلیل و خوار ہو رہا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی وجہ سے اُس ذاتِ گرامی (علیہ التحیۃ والسلام) کی جو نوعِ انسانی کیلئے روشنی کا جگمگاتا چراغ بن کر آئی تھی، ایسی پست تصویر سامنے آتی ہے جس سے اپنوں کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں اور جسے اغیار یہ کہہ کر دنیا کو دکھاتے پھرتے ہیں کہ (معاذاللہ) یہ ہیں مسلمانوں کے پیغمبر! عجمی سازش کے علمبردار یہی چاہتے تھے جسے ہم اس طرح کامیاب بناتے چلے آرہے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جس اسلام کی تعلیم وہ ہو جو ان احادیث میں پیش کی گئی ہے جو سابقہ صفحات میں آپ کی نگاہوں سے گذر چکی ہیں، اس اسلام کو آپ دنیا کے سامنے کس منہ سے پیش کر سکتے ہیں۔ اور جو قوم اس تعلیم کو خدا کی وحی سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھرے اس کے پنپنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ بخاری۔ مسلم۔ موطا۔ سنن امام احمدؒ۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ امام بیہقی۔ وہ کتابیں ہیں جنھیں حدیث کی معتبر ترین کتابیں مانا جاتا ہے۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جنھیں "قرآن کے ساتھ قرآن کا ہم پایہ" قرار دیا جاتا ہے۔ سوچئے کہ جب تک مسلمان ان چیزوں کو دین کی اصل مانتا رہے گا اس وقت تک اس کی موجودہ حالت سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے؟ عجمی سازش نے اسلام سے جی بھر کر انتقام لے لیا ہے۔ لیکن کیا اس کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا؟ یاد رکھو! جس چیز نے باطل کی ان قوتوں کا شیرازہ بکھیرا تھا وہ قرآن تھا۔ انھوں نے اپنی سازش سے قرآن کو مسلمانوں کی نگاہ سے اوجھل کر دیا اور اس کی جگہ اپنا بنایا ہوا مذہب مسلمانوں میں رائج کر دیا اور اسے منسوب کر دیا ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف۔ اب اس سازش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریق ہے کہ جس طرح نبی اکرمؐ نے قرآن کے ذریعے باطل کی تمام قوتوں کو شکست دی تھی، اسی طرح مسلمان پھر قرآن کو اپنی نہجِ زندگی کی اصل قرار دے لے اور اس سے باطل کی قوتوں کو پھر تباہ و برباد کر دے۔

اور اگر آپ (خدانکردہ) یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ آپ کو دوبارہ زندگی عطا کر سکے۔ یعنی آپ عجمی سازش کی ہم نوائی میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نامکمل ہے اور اس کی تکمیل ان روایات سے ہوتی ہے جو عجمی ٹکسالوں میں گھڑی گئی تھیں، تو پھر یہ کہنا چھوڑ دو کہ خدا نے آپ کو ایک مکمل دین دیا تھا۔ یہ کہو کہ خدا نے ایک نامکمل دین دیا تھا جس کی تکمیل عجم کی کمین گاہوں میں جا کر ہوئی۔ اس کا اعتراف کیجئے اور پھر یا تو "گھروں میں بیٹھ کر روئیے" اور یا "پانی میں ڈوب کر مر جائیے" تاکہ آپ کو شہادت کا درجہ نصیب ہو جائے اور آپ اپنے ساتھ ستر ستر آدمیوں کو جنت میں لے جائیں۔

بگو "عجمی" مسلماں را کہ خوش باشد
بہشتے "فی سبیل اللہ" ہم است

اسلام کا نظامِ سیاست

جناب ہارون خاں شروانی صاحب
تلخیص و ترجمہ: جناب اصغر علی صاحب

اسلامی نظامِ سیاست کا موضوع چھیڑتے ہوئے میں سردست احادیث کے ضخیم مجموعوں پر بحث نہیں کروں گا کیونکہ قرآن ہی میں جا بجا ایسے مفصل اور جامع احکام و فرامین ملیں گے جو تاریخی مثالوں سے پُر ہیں۔ میں اپنی گفتگو کو محض قرآن کے سیاسی زاویوں تک محدود رکھوں گا اور جہاں تاریخی مثالوں کا حوالہ آئیگا وہاں کسی معتبر سند کی روشنی میں متن کی وضاحت کروں گا۔

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ رسولِ کریمؐ کی بعثت سے لیکر وفات کی تئیس سالہ سیاسی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے۔ رسول کریمؐ کی عمر اس وقت چالیس سال کی تھی۔ جب مکہ معظمہ سے دو میل کے فاصلے پر غارِ حرا میں وہ مشہور آیت اقرأ باسم ربك الذی نازل ہوئی۔ جس میں انسان کی بے بضاعتی اور علم کی اہمیت جو انسانی عظمت کا ذریعہ ہے، صریح طور پر بیان کی گئی ہے۔ علم الاشیا اور قوانینِ فطرت کا انکشاف قرآن کا بنیادی تصور ہے اور اس کے تمام تر احکام میں صرف اسی پر زور دیا گیا ہے کہ انہی سے انسان پر کائنات کے ابدی قوانین کے رازہائے سربستہ واشگاف ہوتے ہیں۔ اور شاید اسی نظریہ کے پیشِ نظر قرآنی طریقِ حیات کو قدیم اور غیر متبدل کہا جاتا ہے۔

بیعتِ عقبہ (۶۲۰ء) سے اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں کا سراغ ملتا ہے۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ مکہ کی حدود سے باہر ایک ویران گوشے میں صرف بارہ آدمیوں نے پہلی مرتبہ رسول کریمؐ سے پیمانِ وفا باندھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ رسول کریمؐ بے یار و مددگار ایک جھاڑی کے نیچے تشریف فرما ہیں اور یہ بارہ افراد ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرتے ہیں کہ وہ آفاقی اور غیر متبدل قانونِ الٰہی پر عمل پیرا ہوں گے، خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کریں گے، چوری اور بدکاری کے مرتکب نہ ہوں گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے، افترا اور غیبت سے پرہیز کریں گے، اور غم و شادمانی میں وفادار رہیں گے۔

یہاں سے تزکیۂ نفس، اصلاحِ معاشرہ اور عملِ شرعی کا آغاز ہوتا ہے۔ دوسری بیعت جو دو سال بعد کی گئی، رسول کریمؐ کے احکام کی تعمیل اور بشرطِ ضرورت ان کے تحفظ کا تذکرہ واضح طور پر تھا۔ اور رسولِ کریمؐ نے اپنی طرف سے یہ اعلان کیا تھا کہ ان کے اور بیعت کرنے والوں کے حقوق یکساں رہیں گے۔ اسی سال جب مسلمانوں کی مختصر سی جماعت اہل مکہ کے ظلم و تعدی سے پریشان ہو کر رسول کریمؐ کی قیادت میں مدینہ پہنچی تو پیغمبر اسلام نے وہاں اس عظیم اسلامی اخوت کی بنیاد رکھی، جس میں

نسلی، لسانی اور جغرافیائی امتیازات کی کوئی گنجائش نہ تھی اور جہاں مہاجر اور انصار بھائی بھائی کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

مدینہ میں مسلمانوں کو مقامی یہودیوں سے واسطہ پڑا۔ اس نوزائیدہ مملکت کے لئے مسلمانوں کے علاوہ ان یہودیوں کا تحفظ بھی ضروری تھا۔ رسول کریمؐ کی دور اندیشی اور سیاسی فراست اس عہدنامے سے ظاہر ہوتی ہے جس میں یہودیوں کو مسلمانوں کے مساوی شہری حقوق تفویض کئے گئے، اور یہ اعلان کیا گیا کہ مدینے کی یہ دونوں جمعیتیں ایک ہی پارٹی متصور ہوں گی، قانون شکنی کرنے والے خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں سزا کے مستوجب ہوں گے۔ مسلمان اور یہودی مشترکہ طور پر تحفظِ مملکت کے ذمہ دار ہوں گے اور تمام تنازعات خود پیغمبر اسلام طے کریں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر وہ لوگ جنھیں تحفظ کا ذمہ دیا گیا تھا، اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے تو مساوی شہری حقوق اور آزادیٔ ضمیر کا منشور اپنی جگہ برقرار رہتا۔ لیکن یہودی بہت جلد عہدنامہ کی خلاف ورزی پر اتر آئے اور انھوں نے ایسے حالات میں نوزائیدہ مملکت کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کی، جبکہ اہالیانِ مکہ کے حملے کا خطرہ بدستور موجود تھا۔ لیکن پیغمبر اسلام اس سے دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ اور انھوں نے نجران کے نصاریٰ کو بھی منشورِ آزادی دیدیا اور اعلان فرمادیا کہ ان کا مذہب اور جان و مال محفوظ رہیں گے، مذہبی رسومات ادا کرنے میں انھیں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی، کسی پادری کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹایا جائے گا، کسی بت یا صلیب کو برباد نہیں کیا جائے گا، ان سے کوئی محصول نہیں لیا جائے گا اور انھیں عساکر مہیا نہیں کرنے پڑیں گے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ان اہل ذمہ کی مسلح سازشوں کی وجہ سے ان عظیم عہدناموں میں سے کوئی بھی موثر ثابت نہیں ہوسکا۔ یہودیوں کے قبیلوں کو یکے بعد دیگرے مدینہ سے نکالنا پڑا اور پیغمبر اسلام کو غسان کے نصاریٰ کے خلاف مہم بھیجنی پڑی کیونکہ انھوں نے مدینہ کے ایک پُرامن سفیر کو قتل کر دیا تھا۔ بہرصورت وفات سے قبل پیغمبر اسلام نے تمام عرب کو ایک قانون کا مطیع بنا دیا تھا۔ اور اس ملک کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ یہ سیاسی معجزہ ان لاتعداد انسانوں کی وحدتِ فکر و عمل کا نتیجہ تھا جو ۷ مارچ ۶۳۲ء کے تاریخی دن پیغمبر اسلامؐ کا خطبہ حجۃ الوداع سننے کو جمع ہوئے تھے۔ وہ خطبہ انسانی تاریخ میں ایک اہم ترین اعلان ہے۔ یہ امر ان لوگوں کے لئے جو عرفات کے میدان میں جمع تھے فی الواقع وجۂ صد افتخار تھا کہ جس مہم کا آغاز ان کے پیغمبر نے بمشکل بیس سال قبل کیا تھا وہ آج بخیر و خوبی سرانجام دی جا چکی تھی۔ رسول کریمؐ نے اس واقعہ کے پورے دو ماہ بعد ۸ جون ۶۳۲ء کو انتقال فرمایا۔

اس عظیم الشان ہستی کے چند اہم ترین سیاسی کارناموں پر جس نے عملاً ساری بنی نوع انسان کی زندگی کا رخ بدل دیا، نظر ڈالنے کے بعد میں اب موضوع کے تمام گوشوں پر بحث کر سکوں گا۔ سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ سیاسی استدلال کا جو طریق قرآن نے اختیار کیا ہے وہ تاریخی طریقِ استدلال ہے جس میں عمومی تصورات کی وضاحت عرب اور ہمسایہ ملکوں کے تاریخی شواہد سے کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ جہاں قرآن کوئی مجرد نظریہ پیش کرتا ہے، وہاں بھی وہ اہلِ عرب کی قدیم تاریخ کے

نتائج کی روشنی میں اس کی تشریح کرتا ہے۔ قرآن قدیم سلطنتوں اور دوسری قوموں کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے اوران کے زوال کے بین اسباب کا تجزیہ کرتا ہے تاکہ آنے والے عبرت حاصل کرسکیں۔ مثلاً قدیم سلطنتوں میں مصر کو صحیح طور پر قدیم ترین اور محکم ترین سلطنت کہا گیا ہے۔ لیکن یہ سلطنت اس لئے نیست ونابود ہوگئی کہ اس کے حکمران انسان کی بے مائیگی اور قانونِ الٰہیہ کی ہمہ گیری کا صحیح ادراک نہ کرسکے۔ حضرت موسیٰؑ اوران کے بھائی کو فرعونِ مصر کے پاس اس لئے بھیجا گیا تھا کہ اس نے قانونِ الٰہیہ سے سرتابی کی تھی۔ اور وہ ارضِ خداوندی پر ظلم وتشدد کا علمبردار تھا۔ اس کا ایک بڑا جرم یہ بھی تھا کہ اس نے اپنی قوم کی وحدت قائم رکھنے کی بجائے اسے گروہوں میں تقسیم کردیا تھا، جن میں سے کسی پر اس کا لطف وکرم ہوتا تھا اور کسی پر غیض وغضب، اوراس طرح وہ خدا کی مخلوق پر تطاول وتعدی کا مرتکب ہورہا تھا۔ قرآن اسرائیلیوں کی مثالیں دے کر واضح کرتا ہے کہ خدا نے انھیں اپنے خاص لطف وکرم سے سرفراز کیا، اور نہ صرف ان میں سے پیغمبر پیدا کئے، بلکہ انھیں بادشاہت بھی بخشی۔ اور جب حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد ان پر ظلم شروع ہوگیا اور انھیں گھروں سے نکالا جانے لگا تو انھیں طالوت جیسا حکمراں دیا گیا (۲۴۷-۲) اس تمام واقعہ سے یہ حقیقت نمایاں طور پر ابھرتی ہے کہ ایک اچھے امیر کے لازمی اوصاف علم اور قوت ہیں۔ یہ اوصاف آج بھی اسی قدر مسلم ہیں جس قدر کہ صدیوں پہلے تھے۔

قرآن قوموں کے اصلی طرزِ حکومت کا حوالہ دیئے بغیر ان کے زوال کے اسباب کی تعمیم بھی کرتا ہے۔ اور یہ عظیم الشان کلیہ قائم کرتا ہے کہ خدا اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ تبدیلی ان کے ضمیر کی گہرائیوں سے نہ پھوٹے۔ چونکہ کائنات کے قوانین فی نفسہ کسی ناانصافی پر مبنی نہیں ہیں اس لئے ہر ملت کو پہلے صحیح کردار کے اصول وقواعد سے آگاہ کردیا جاتا ہے لیکن جب وہ سرکشی کرکے ان حدود کو توڑ دیتی ہے توکسی دوسری ملت سے بدل کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کائنات کا سلسلہ ایسا ہے کہ قومیں بھی افراد بنی نوع انسان کی طرح عروج وزوال کی منزلوں سے گزرتی ہیں۔ جب ملّی امراض ناقابلِ علاج ہوجاتے ہیں تو قومیں افراد کی طرح راہیٔ ملکِ عدم ہوجاتی ہیں۔ اوران کی جگہ نئی اور زیادہ صحت مند قومیں ابھر آتی ہیں۔

قرآن خدا کی وحدت اور زمین پر اس کی حکمرانی کے تصورات سے پُر ہے۔ اس تصورات سے تین نمایاں نظریات مترشح ہوتے ہیں، جن کا تعلق قرآن کے سیاسی گوشوں سے ہے۔ اول تو یہ کہ ایک حکمراں کی حیثیت سے خدا کی وحدت کا تصور قانونی وحدت کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور جیسا کہ خود قرآن صراحت کرتا ہے، اس کے شرعی احکام کائنات کے غیر متبدل قوانین سے ہم آہنگ ہیں۔ دوسری بات جو یاد رکھنی چاہئے یہ ہے کہ جیسے ایک بادشاہ کی نظر میں اس کی تمام رعایا مساوی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح خدا کی حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام انسان اس کے نزدیک برابر ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ انسان قانونِ فطرت کو بدلنے کی قوت نہیں رکھتا ۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ نظامِ کائنات کے اسرارِ پوشیدہ کی جستجو کرتا رہے، بالکل اس طرح جیسے کوئی سائنسداں قوائے فطرت کا سراغ لگاتا ہے یا جیسے کوئی عالم معاشیات انسان اور معاشی دولت کے قدرتی رشتہ کی

چھان بین کرتا ہے۔

قانونِ خداوندی کی حکومت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں، یا کم از کم اس کے احکام کے مطابق زندگی گذارنے پر رضامند ہوتے ہیں وہ ہر نوع کے زیاں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ حکم عدولی کے مرتکب ہوتے ہیں وہ حکومت کی حفاظت سے محروم ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے آجکل کی حکومتوں میں مجرم سزائے قید، جرمانہ یا قتل کے مستوجب قرار دیئے جاتے ہیں۔ کائنات کا حقیقی حاکم اللہ ہے، اسی کا قانون سب پر نافذ ہے، انسان زمین پر اس کا نائب[1] ہے جس کا اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ قانونِ الٰہی کے مطابق دنیا میں عدل قائم کرے۔ یہ ہے قرآن کی تعلیم، اور یہی ہے عدل کا وہ نصب العین جس سے انسان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور جسے آج دنیا بھر میں انسان کا مقدس ترین حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

قرآن کے نزدیک فتنہ و فساد سے زیادہ کوئی شے نفرت انگیز نہیں، کیونکہ انہی سے نظامِ سیاست میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس موضوع پر قرآن میں جگہ جگہ آیات موجود ہیں۔ جب اللہ نے انسان کو اپنا نائب[1] بنایا تو فرشتوں کو شبہ ہوا کہ وہ دنیا میں قتل و غارت گری اور فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ دوسری جگہ اللہ نے اسرائیلیوں کو حکم دیا کہ وہ ایک دوسرے کا خون نہ بہائیں، اور نہ ایک دوسرے کو گھروں سے نکالیں۔ یہ ہدایت قرآن میں بار بار آئی ہے، کیونکہ انسان کی انسان سے عداوت میں اعتدال پیدا کرنا ضروری تھا۔ قرآن کے نزدیک قتل سے فساد قبیح تر ہے اور جو لوگ فساد برپا کرتے ہیں ان پر خدا کی لعنت نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے حکومت کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ فساد کو حتی الامکان پرامن ذرائع سے رفع کرے۔ لیکن اگر حالات مقتضی ہوں تو پوری قوت سے اس کا استیصال کرنا چاہیئے۔ جو لوگ سیاسی جنگ و جدل کی طرح ڈالتے ہیں ان کی اطاعت لازم نہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کو قتل کر دینا چاہیئے یا جلا وطن کر دینا چاہیئے۔ اس عمل کو قرآن نے خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ کا مترادف قرار دیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لئے مکہ کو اپنا مسکن بنایا تو انھوں نے خدا تعالیٰ سے پہلے یہی دعا مانگی کہ وہ ہمیشہ امن اور خوشحالی کا گہوارہ بنا رہے۔ اسلامی نظامِ سیاست کی کامیابی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس نے متخالف اور معاند عناصر میں اتحاد و یگانگت پیدا کر دی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ متحد رہیں، ایک دوسرے سے ہمدردی کریں اور بھائی بھائی بن کر رہیں۔ ورنہ ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو دوسرے مفسدین کا ہوتا ہے۔

یہ ان اسلامی اصول حرب کے عین مطابق ہے جن کا تذکرہ خصوصاً دوسری سورۃ میں آیا ہے۔ اس سورہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ مملکت کے خلاف جنگ کرتے ہیں ان کے خلاف جہاد لازم ہے، اور جونہی وہ جنگ سے باز آئیں اور قانونِ الٰہی کی حاکمیت تسلیم کر لیں تلوار کو نیام میں رکھ لینا چاہیئے۔

یہ اصول قرآن کی حقیقی روح کے مطابق ہے۔ کیونکہ دو بنیادی نظریے جو قرآن نے پیش کئے "ایمان" (بمعنی امن) اور "اسلام" (بمعنی اطاعت) کی اصطلاحوں میں مضمر ہیں۔ ساتھ ہی یہ اصول اقتدار کے جدید تصور کے بھی عین مطابق ہے۔ کیونکہ کسی مرکزی اقتدار کی اطاعت کے بغیر حکومت کا تصور بے معنی ہے۔ علاوہ بریں کیونکہ قانون الٰہیہ سب سے ارفع اور ہمہ گیر ہے، اس لئے

---

[1] انسان خدا کا نائب نہیں۔ یہ عقیدہ غیر قرآنی ہے۔ طلوعِ اسلام

بالکل جائز طور پر انسان کو ہدایت کی گئی ہے کہ اس ضابطے کے سامنے جو رسول کریمؐ پر وحی کی صورت میں نازل ہوا، سر تسلیم خم کرے۔ گمراہوں کو انتباہ کیا گیا ہے کہ وہ نام نہاد ضابطہ ہائے زندگی جو ان کے آباؤ اجداد نے اختیار کئے تھے، درست نہیں تھے۔ کیونکہ ان کی فراست محدود اور قانونِ فطرت کا ادراک ناقص تھا اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر ان کے مابین کسی مسئلے کے بارے میں اختلاف پیدا ہو، تو وہ قانون کی طرف رجوع کریں جو ان کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔ جس میں انھیں اپنے تمام مسائل کا حل مل جائیگا۔

مسلمانوں کے لئے صرف ایک مجہول قسم کی اطاعت ہی کافی نہیں، بلکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر حالات کا اقتضا ہو تو وہ دنیا میں قانونِ الٰہی کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بہ رضا و رغبت اپنا سب کچھ قربان کر دیں اور ہر طرح کی اذیت، بھوک اور مصائب کا مقابلہ کریں۔ یہ کہنا لاحاصل ہے کہ خود رسولِ کریمؐ اپنی بارہ سالہ مکی زندگی میں پابندی سے اس اصول پر عمل پیرا رہے۔ گو انھیں پریشان کیا گیا، ان پر سنگ باری کی گئی، انھیں اذیتیں پہنچائی گئیں، ان کے خلاف سازشیں کھڑی کی گئیں اور بالآخر وہ اپنے ان ساتھیوں سمیت جن کی نظریں وہ خیرِ مجسم تھے مکہ سے دو سو میل دور مدینہ کو ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

قرآن انسانی مقتضیات کا صحیح اندازہ . . کر کے یہ اعلان کرتا ہے کہ گو قانونِ الٰہی کی خاطر اتنی عظیم قربانیاں ایک فرد کے نقطۂ نظر سے سخت اور ناگوار ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ بالکل لابدی اور ناگزیر ہیں کیونکہ انجام کار وہ مجموعی حیثیت سے قوم کے لئے سود مند ہوتی ہیں۔ اس سے انفرادی اور اجتماعی مفادات کا بنیادی تضاد بھی واضح ہوتا ہے۔ اور فرد کے لئے اجتماعی مفاد کی خاطر اپنی دولت اور زندگی قربان کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر قرآن اعلان کرتا ہے کہ قتل کے معاملے میں قصاص ہی میں قوم کی زندگی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس کے بغیر انسانی زندگی کا احترام ممکن نہیں۔ قرآن کے قوانین محض قتل اور چوری کے جرائم یا قصاص کے اس عظیم اصول تک ہی محدود نہیں، بلکہ قرآن قانونی شہادت حتیٰ کہ قانونی دستاویز نویسی کے بھی عمومی اصول بیان کرتا ہے۔ مثلاً یہ اصول کہ قرض وغیرہ کے معاملات کو ہمیشہ ضبطِ تحریر میں لے آنا چاہئے۔ یا یہ کہ فروخت اور رہن کے معمولی کاروبار کو ضبطِ تحریر میں لانا ضروری نہیں، اور یہ کہ کسی لین دین کو ثابت کرنے کے لئے صرف دو شہادتیں کافی ہیں۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان بنیادی اصولوں کو نہ صرف رسول کریمؐ کی زندگی یا ساتویں صدی عیسوی میں ہی کافی اثر و نفوذ حاصل ہوا بلکہ موجودہ دور کے قوانین میں بھی ان کے حقیقی اثرات موجود ہیں۔

ان امور سے قرآنی نظام میں قانونِ عدل کی زبردست اہمیت ہم پر واضح ہوتی ہے۔ رسالت، بنیادی عدالت بیان کی جاتی ہے کیونکہ منقول ہے کہ قدیم زمانے کے پیغمبروں کو آسمانی کتابیں دے کر اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ انسانوں کے باہمی تنازعات طے کریں اور پیغمبرِ اسلامؐ نے اعلان کیا کہ مجھے عدل پر مامور کیا گیا ہے۔

منصفوں کے لئے عدل و انصاف ہی کا حکم ہے نہ یہ کہ وہ اپنی ذاتی پسند یا ناپسندیدگی، محبت یا نفرت سے متاثر ہوں۔ اور گواہوں کے لئے ہدایت ہے کہ وہ سچ بولیں۔ ساتھ ہی یہ صحت مند اصول بھی وضع کیا گیا ہے کہ جھوٹا استغاثہ کرنے والے کو سخت سزا ملنی چاہئے۔ یہ اصول ہر حکومت کیلئے لازمی اور ناگزیر ہیں، ان کی اساس کچھ ہی ہو لیکن ان کی عالمگیر موزونیت سے انکار

نہیں کیا جا سکتا۔

اُن معاشرتی اصلاحات کا تذکرہ میرے احاطۂ مضمون سے باہر ہے جو قرآن نے ایک ایسے معاشرے میں نافذ کیں۔ جو قبائلی حدود کے علاوہ اور کسی پابندی سے آشنا نہ تھا اور نہ میں اس بظاہر ناممکن الحصول اتحاد و برادری کے متعلق گفتگو کروں گا جسے قرآن اعدائے سابقہ میں ائتلافِ قلبی اور عناصرِ متحارب کی یگانگت کا نام دیتا ہے۔ جو لوگ قانونِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتے ہیں قرآن انھیں ہدایت کرتا ہے کہ وہ حبل اللہ سے اعتصام کریں اور باہمی تفرقہ اندازی سے مجتنب رہیں۔ قرآن مسلمانوں کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی بیان کر جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ جب تک مالکِ مکان اجازت نہ دے کوئی کسی دوسرے کے مکان میں داخل نہ ہو۔ حتیٰ کہ ایسے مواقع پر جبکہ آپ کو خلوت کی ضرورت ہے تو آپ کے بچوں کو بھی کمرے میں اجازت لیکر داخل ہونا چاہئے۔ یا یہ کہ تاجروں کو اپنا سامان معین اوزان کے مطابق تولنا چاہئے یا یہ کہ چوری، زنا، بہتان وغیرہ شرمناک افعال کی روک تھام کرنی چاہئے۔ اس نوع کی بہت سی معاشرتی اصلاحات کا قرآن میں جا بجا ذکر ہے اور یہ اصلاحات صرف نظریات کے طور پر پیش نہیں کی گئیں تھیں بلکہ سرکش عربوں کو ان پر عمل پیرا کیا گیا اور اس طرح صحرا کے بدو اعلیٰ مدبر، جرنیل، تاجر اور حکمراں بن گئے اور ان لوگوں سے بھی برتر ہو گئے جو اپنے ہزاروں سال کی پرانی تہذیب پر نازاں تھے۔

قرآنی حکومت میں مشاورت کو ایک اہم مقام حاصل ہے جہاں اچھے مسلمانوں کے اور اوصاف گنوائے گئے ہیں یا انھیں خدا پر توکل کرنے والوں کے نام سے یاد کیا گیا ہے، جہاں انھیں معصیت سے پرہیز کرنے والے اور انسانی حقوق کے نگہبان کہا گیا ہے، وہاں ان کی یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ ضرورت کے وقت آپس میں مشاورت کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ رسولِ کریمؐ کو بھی ہدایت کی گئی کہ جہاں انھیں ایک مرتبہ فیصلہ کرنے کے بعد خدا کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہئے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مسئلہ پر پہلے مشاورت طلب کر لیں۔ . . . . . اسی صحیح جمہوری جذبہ کے پیشِ نظر جس میں نہ صرف مشیروں کی تعداد بلکہ ان کی صلاحیت کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا دینِ قرآنی نے دنیا سے کم از کم اپنے بنیادی اصولوں کا لوہا منوا لیا۔ اس جذبہ کی مزید شہادت اس اصول سے ملتی ہے جس پر قرآنی محصولات (Qurani Taxation) کی اساس ہے۔ درحقیقت پیغمبر اسلامؐ کی سیدھی سادی زندگی کی طرح قرآنی بنیادوں پر قائم کی ہوئی حکومت بھی سیدھی سادی تھی اور اپنے قیام کے لئے وسیع مالیات کی محتاج نہ تھی۔ اس طرح قرآن نے ایک اعلیٰ اور کم صرفہ نظامِ حکومت کی مثال قائم کی۔

قرآن میں صرف تین محصولات کا ذکر ہے۔ ۲½ فی صدی زکوٰۃ[1]، جزیہ، جو غیر مسلموں سے عسکری خدمات سے مستثنیٰ ہونے کی صورت میں واجب الوصول تھا، اور خراج جو اراضی پر لگان کی شکل میں تھا۔ جنگوں کا غیر معین مالِ غنیمت ان محصولات سے علاوہ تھا۔ جہاں تک زکوٰۃ اور مالِ غنیمت کا تعلق ہے قرآن نے ان کی تقسیم کی مدات مقرر کر دی ہیں۔ ان کا صرف ایک مخصوص حصہ

---

[1] قرآن نے "زکوٰۃ" کی شرح کہیں متعین نہیں کی۔ طلوعِ اسلام

حکومت کی تحویل میں دیدینا ہوتا ہے، اور باقی حصہ اس طرح تقسیم ہو کہ دولت مندوں کے مال و متاع میں سے کچھ حصہ ملک کے غریبوں اور محتاجوں کو ملے، اور حکومت کے مصارف کا بڑا جزء دوسرے ذرائع آمدنی سے حاصل ہو۔

لیکن قرآن کی اکملیت کا صحیح احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم بین الاقوامی معاملات، قوانینِ جنگ، تدبر سیاست اور معاہدوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جنگ کا پہلا اصول جو پیغمبر اسلام کو بذریعہ وحی تعلیم کیا گیا یہی تھا کہ جہاد محض اس لئے ضروری ہے کہ دشمنوں نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے، اور جہاد صرف ان ہی لوگوں کے خلاف جائز ہے جنھوں نے عملی طور پر مسلمانوں کی نوزائیدہ قوم کے خلاف جنگ کی طرح ڈالی ہے۔ اور جنگ جاری اس وقت تک رکھنی چاہئے جب تک کہ فتنہ کا مکمل طور پر سدباب نہ ہو جائے۔ اسی اثناء میں اگر دشمن معاہدۂ امن پر آمادگی کا اظہار کرے تو اس کی پیشکش کو رد نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن ان کفار سے معاہدے اور دوستی کی اجازت ہرگز نہیں دیتا جو قانونِ الٰہی سے بغاوت کرتے ہیں۔ اور جب ایک دفعہ ان کے خلاف جہاد شروع کر دیا جائے تو ان کے ساتھ کسی قسم کی رورعایت نہیں کرنی چاہئے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ وحی نے بار بار اس فرق کو نمایاں کیا ہے جو غیر مسلموں کے ان دو گروہوں کے درمیان تھا جن میں سے ایک تو مسلمانوں کا معاہدہ تھا اور دوسرے نے اپنے معاہدوں کو توڑ دیا تھا اور مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو قطعی طور پر یہ حکم دیدیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کبھی اپنے معاہدے نہ توڑیں جو اپنے قول و قرار پر کاربند رہتے ہیں۔

قرآن نے جنگی قیدیوں کے ساتھ جس نرمی کی تلقین کی ہے وہ انسانی معاشرے میں ایک غیر معمولی ترقی کی آئینہ بردار ہے۔ جنگ بدر سے جنگی قیدیوں کو زندہ رکھنے بلکہ انھیں حقیر سے تاوان پر رہا کرنے یا ان سے بچوں کی تعلیم جیسا کوئی مفید کام لینے کا دستور جاری کیا گیا، انہی عربوں کو جن کی عورتیں بھی میدان جنگ میں مرتے ہوئے انسانوں پر ترس نہیں کھاتی تھیں، اس یوم عظیم کے لئے تیار کیا جا رہا تھا جب پیغمبر اسلامؐ ہزاروں مجاہدین کے سپہ سالار کی حیثیت سے فاتح بن کر مکہ میں آئے اور فاتحین میں سے کسی نے بھی ان لوگوں کو چھوا تک نہیں جنھوں نے کچھ عرصے پہلے انھیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اب ہم رواداری کے اس عظیم اصول کی طرف آتے ہیں جسے قرآن نے نہایت حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ابھی صرف ساتویں صدی عیسوی تھی اور دنیا مذہبی رواداری کے نام تک سے ناآشنا تھی۔ اس لئے سیاسی نظریات کی تاریخ میں یہ بات بڑی عجیب اور حیران کن تھی کہ قرآن نے متفرق مذہبی عقائد کو مسلمات کا درجہ دیدیا اور اس مبانی پر اس عظیم الشان نصب العین کی عمارت استوار کر دی کہ "دین میں جبر و اکراہ کی گنجائش نہیں ہے"۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کو جب وہ فرعون کے پاس گئے، نرم کلامی کا حکم دیا گیا تھا، اسی طرح مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ جب وہ کسی اور مذہب و عقیدہ کے لوگوں سے بات چیت کریں، تو ان کی گفتگو کا انداز نہایت مصالحانہ ہونا چاہئے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ نصب العین اس شخص نے پیش کیا جو بذاتِ خود ہر نوع کی اذیتوں کا شکار بن چکا تھا۔ اسے حکم تھا کہ اگر آبادی کا صرف ایک حصہ ایمان لائے تو اسے آبادی کے دوسرے حصے کے متعلق خدا کے احکام کا منتظر رہنا چاہئے۔ اگرچہ مسلمانوں کو مخالفوں اور منافقوں کے ساتھ

دوستی و محبت سے منع کیا گیا ہے تاہم قرآن نے ایسے لوگوں اور ان عیسائیوں کے درمیان جو اپنے نبیوں کی تعلیمات کے پیش نظر نرم دل اور خدا ترس تھے ایک خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے۔ جہاں تک مکہ کے غیر مسلموں کا تعلق ہے ایک پوری کی پوری سورت ان سے متعلق نازل ہوئی ہے۔ اور آخر میں یہ عظیم الشان اصول وضع کیا گیا ہے کہ "قل یا ایھا الکفرون لا اعبد ما تعبدون" یہ بات اہم ہے کہ اگرچہ مذہبی فکر کا رخ اس صحت مند نظریہ کے ہمہ گیر اطلاق کی سمت رہا ہے لیکن موجودہ دور میں بھی دنیا کے بعض اہم حصوں میں مذہبی ایذا رسانی کے قدیم وحشیانہ جذبہ کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اور اپنے ہی ہم وطنوں اور ہم زبانوں کو محض اس لئے نہیں اپنایا جا رہا ہے کہ ملک کے باشندوں کی اکثریت سے ان کے مذہبی عقائد مختلف ہیں۔

آخر میں اب میں بین الاقوامیت کے اصول کی طرف آتا ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب قرآن نازل ہوا تو دنیا میں متخاصم اور محارب قوموں، جماعتوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی تھی، اور اسلام نے بین الاقوامیت کا نظریہ پیش کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا بلاشبہ یہ ایک دلیرانہ اقدام تھا۔ لیکن یہ اقدام قرآن کے دوسرے اصولوں کے عین مطابق تھا۔ اگرچہ قرآن اس نظریہ کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان طبقات میں منقسم ہے اور مدارج کا تعین اس لئے جائز ہے کہ صلاحیتیں پرکھی جا سکیں، لیکن یہ بالکل واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ ذات پات کی تمیز اور متخاصم جماعتوں کا وجود ایک نوع کا عذاب ہے، جو گمراہی پر نازل ہوتا ہے۔ اور جو قومیں اور قبیلے بھی موجود ہیں ان کا طبعی سرچشمہ ایک ہی ہے، اور ان کے وجود کا جواز صرف یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے ممیز ہو سکے پھر دوسرا نظریہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ کسی مخصوص خاندان، نسل، قبیلے یا قوم سے متعلق ہونا برتری کا معیار نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی معیار ذاتی کردار کی بلندی ہے۔ اس شخص کی زندگی جس نے اپنی عزیزہ کی شادی ایک آزاد شدہ غلام کے ساتھ کی، جس نے ایک آزاد شدہ غلام کو قریش کا کمانڈر مقرر کر دیا، جس نے اپنے اقتدار کے پورے عروج پر بھی غریب ترین انسان کی سی زندگی بسر کی، جس کے دل میں مظلوموں اور مصیبت زدوں کی بہبودی کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہ تھا، یہ پرانی قیود کے خلاف ایک زبردست بغاوت کی زندہ مثال ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بین الاقوامیت کے علمبرداروں کی راہ میں ہمیشہ سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ وہ نسلی، لسانی اور جغرافیائی حدود کو عبور نہیں کر سکتے۔ اور خواہ انسان کی تمنائیں اور نظریات کتنے ہی مقدس کیوں نہ ہوں، وہ ابھی تک ان حدود کو عبور نہیں کر سکا ہے۔ اور نہ ہی "پارلیمانِ آدم" یا "وفاقِ عالم" قائم کرنے کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر ہو سکا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے انسان کو ایک راہ دکھائی۔ قانونِ الٰہی کی راہ۔ جو نسلی، ملکی، لسانی اور جغرافیائی حد بندیوں کے برعکس تمام بنی نوعِ انسان کے لئے قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ رسول کریمؐ نے روم، فارس، حبشہ، عرب اور دوسرے ملکوں کے باشندوں کے ساتھ جو قانونِ الٰہی پر ایمان لائے تھے ایک عظیم الشان اتحاد قائم کر کے نہ صرف ایک نظریہ ہی پیش کیا بلکہ اس نظریہ کی اکملیت اور کامیابی کا عملی ثبوت بھی بہم پہنچایا۔

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

کے

چند عنوانات

آنحضرتؐ کا بچپن ——— اسوۂ محمدیہ پر ایک نظر ——— گنبدِ خضراء

حضرت ابوذر غفاریؓ ——— حضرت اویس قرنیؓ ——— مثنوی اسرارِ خودی

پیامِ مشرق ——— جاوید نامہ ——— ضربِ کلیم ——— اسبابِ زوالِ امت

عربی خط ——— نابینائی ——— سفرِ حج ——— میری طالب علمی

بڑا سائز ——— ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت مجلد چار روپے۔ محصول ڈاک نو آنے

ادارہ طلوعِ اسلام، رابسن روڈ۔ کراچی

شیعہ

(علامہ اسلم صاحب جیراجپوری)

[طلوع اسلام کی ایک سابقہ اشاعت میں، نادر شاہ اور اتحاد سنی و شیعہ کے عنوان سے علامہ اسلم صاحب کا مضمون شائع ہوا۔ اس پر بہت سے حضرات نے کہا ہے کہ فرقہ شیعہ کے بنیادی مذہبی عقائد کے متعلق بھی کچھ لکھنا ضروری ہے کیونکہ ان کے متعلق صحیح معلومات بہت کم پائی جاتی ہیں۔ ان حضرات کے تقاضے اور اس ضرورت کے پیش نظر، علامہ اسلم صاحب کا یہ مضمون درج طلوع اسلام کیا جاتا ہے جو ان کی تصنیف، تاریخ الامت جلد ہشتم سے ماخوذ ہے۔

طلوع اسلام نہ شیعہ ہے نہ سنی۔ نہ اہل حدیث نہ اہل قرآن۔ یہ کسی فرقہ سے بھی متمسک نہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک فرقہ بندی از روئے قرآن شرک ہے۔ اس لئے اس میں اگر کسی فرقہ کے متعلق کچھ شائع ہوتا ہے تو وہ محض بغرض معلومات ہوتا ہے اور اگر کسی فرقہ کے کسی مسلک پر تنقید ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے فرقے کے نقطۂ نگاہ سے نہیں ہوتی بلکہ خالص قرآن کی روشنی میں ہوتی ہے۔ اسلئے زیر نظر مضمون کو بھی اسی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ خود علامہ اسلم صاحب کا بھی یہی مسلک ہے۔ اس لئے ان کے اس قسم کے مضامین میں بھی "حبِ علیؓ یا بغضِ معاویہؓ" کے محرکات کی تلاش بے سود ہوگی۔ ان کا قلم صرف خدا کے لئے اٹھتا ہے اور اس کی کتاب کی تعلیم کی نشر و اشاعت ان کا وظیفۂ زندگی ہے۔ طلوع اسلام]

شیعہ کا اختلاف بھی جمہور امت سے خلافت ہی کے مسئلہ میں ہے۔ اور یہ فرقہ بھی خوارج کی طرح خالص سیاسی ہے جس پر بعد میں دینی رنگ چڑھا دیا گیا۔

شیعیت کا پہلا تخم صحابہؓ میں سے وہ جماعت تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتی تھی مثلاً حضرت عباسؓ، ابوذر غفاریؓ، مقداد بن اسودؓ، عمار بن یاسرؓ اور سلمان فارسی وغیرہ لیکن یہ خیال سادہ تھا جس میں نہ نبی کی طرح امام کی تقدیس شامل تھی نہ اس کے منصوص ہونے کا عقیدہ تھا۔ بلکہ صرف حضرت علیؓ کی محبت، عظمت اور قرابتِ رسول کی خصوصیت کی وجہ سے ان کو خلیفہ دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

لیکن انتخاب حضرت ابوبکرؓ کا ہو گیا اور تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کی بیعت کر لی اور اپنی خلافت کا نہ دعویٰ کیا نہ اپنے حق کی کوئی نص پیش کی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ جب خلیفہ ہوئے تو ان کے ہاتھ پر بھی بیعت کی اور ان کی زندگی بھر ان کے حامی اور مطیع رہے۔ پھر حضرت عثمانؓ کی خلافت کو بھی تسلیم کیا۔

حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوجانے کے چند سال بعد اپنے خاندان بنی امیہ کے اثر میں آگئے۔ اور بڑی بڑی ولایات کی حکومتیں ان کو دیدیں، جس سے حریفوں کی نگاہوں میں ان کی خلافت کا انداز اموی حکومت کا معلوم ہوا۔ اس وقت مخفی جمعیتیں قائم کی گئیں اور عبداللہ بن سبا کی سازش سے جو صنعا کا یہودی تھا عراق سے لیکر مصر تک ان کے خلاف بغاوت پھیلائی گئی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ان مقامات کے لوگوں نے مدینہ میں آکر حضرت عثمانؓ کو قتل کر ڈالا اور حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اس سبائی تحریک میں شیعیت میں وصی کا عقیدہ داخل کیا گیا یعنی مشہور کیا گیا کہ رسول اللہؐ نے اپنے بعد حضرت علیؓ کی خلافت کی وصیت کی ہے اور وہ ان کے وصی ہیں۔

بعد میں اس کی تشریح یہ کی گئی کہ امام جمہور کے انتخاب سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ امامت دین کا رکن ہے اور ان عام مصالح میں سے نہیں ہے جو امت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے خود نبی کا فریضہ ہوتا ہے کہ اپنے بعد امام کو متعین کر جائے۔ پھر ہر امام دوسرے امام کی تعیین کرتا ہے۔

اماموں کا انتخاب اللہ کے ہاتھ میں رکھ دینے کی وجہ سے ان کی عظمت کا بھی دعویٰ کیا گیا کہ وہ ہر قسم کے گناہ بلکہ غلطی و خطاء سے بھی معصوم ہیں۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر امام منصوص کی معرفت اصول ایمان میں سے قرار دی گئی اور یہی نقطہ مومن اور کافر کے درمیان حد فاصل رکھا گیا۔ پھر یہ تلقین کی گئی کہ یہ امامت صرف حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا حق ہے۔ اس طرح بتدریج خاندانی حکومت کا سیاسی دعویٰ مذہب بنا لیا گیا۔

اس جماعت میں خوارج سے بھی زیادہ فرقے ہوئے۔ کچھ تو دینی مبادی میں اختلافات کی وجہ سے اور کچھ ائمہ کی تعیین میں لیکن اکثر منقرض ہوگئے۔ اب ان کے بڑے فرقے دو باقی رہ گئے ہیں۔ زیدیہ و امامیہ۔

زیدیہ یہ جماعت امام زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کی پیرو ہے۔ اور شیعہ میں سب سے زیادہ معتدل اور اہل سنت سے قریب تر ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ امام زید رئیس معتزلہ واصل بن عطاء کے شاگرد تھے اور اس کی تعلیم کا اثر ان کے اوپر پڑا تھا۔ وہ فاضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی خلافت کو جائز سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے حضرت علیؓ کو جملہ صحابہ میں افضل مان کر بھی شیخین کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے۔ امام کی تعیین کے لئے وحی الٰہی یا نص کے قائل نہ تھے۔ بلکہ بنی فاطمہ میں سے جو بھی عالم، زاہد، سخی، شجاع ہو اور اہلیت رکھتا ہو اور امامت کا دعویٰ لیکر کھڑا ہو جائے وہ امام ہے۔

ان کے نزدیک امامت محض نظری شے نہیں تھی بلکہ عملی تھی جس کے لئے خروج لازمی تھا۔ ۱۲۲ھ میں انھوں نے جب ہشام بن عبدالملک کے مقابلے میں خروج کیا تو شیخین کی خلافت کے قائل ہونے کی وجہ سے شیعہ امامیہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، اور الگ ہوگئے اور اسی دن سے رافضی کہے جانے لگے۔ آخر وہ مقتول و مصلوب ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ اپنی امامت کا دعوے لیکر اٹھے وہ بھی ۱۲۵ھ میں مارے گئے۔

آج یمن کے مسلمانوں میں بڑی تعداد اس فرقہ کی ہے۔ اہل سنت سے ان کے اختلافات اصول و فروع میں بہت تھوڑے ہیں۔

امامیہ ان کا نام امامیہ اس لئے رکھا گیا کہ ان کی تمام مذہبی تعلیمات کا مرکزی نقطہ امام ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق ہے، نہ صرف اہلیت و صلاحیت کے باعث بلکہ بطریق النص۔ پھر ان کے بعد امامت انھیں کی فاطمی اولاد میں محصور ہے۔ جو یکے بعد دیگرے متعین ہیں، اور ان کی معرفت اصول ایمان میں سے ہے۔

ان کے دو فرقے ہیں۔ اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ۔ اسماعیلیہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام سادس جعفر صادقؒ کے بیٹوں میں سے امامت موسیٰ کاظمؒ کی طرف نہیں منتقل ہوئی جیسا کہ اثنا عشریہ کا خیال ہے بلکہ اسماعیل امام ہوئے۔ اسی نسبت سے اس جماعت کا نام اسمٰعیلی رکھا گیا۔ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ امام کے پاس جب قوت نہ ہو تو وہ مستور رہے اور صرف اس کے دعاۃ تبلیغ کریں۔ چنانچہ ان کے ائمہ برابر مخفی رہے۔ یہاں تک کہ عبداللہ المہدی قوت حاصل کرنے کے بعد ظاہر ہوا۔ اور ۲۹۵ھ میں اس نے افریقہ میں فاطمی خلافت قائم کی۔ غالباً اسی وجہ سے یہ جماعت باطنی کہی جاتی ہے۔

اثنا عشری بارہ امام کے قائل ہیں جو سلسلہ بہ سلسلہ حضرت علیؓ سے امام غائب تک ہیں۔ توضیح کیلئے ان کا مختصر شجرہ لکھ دیتا ہوں

۱۔ حضرت علیؓ ابن ابیطالب

۲۔ امام حسنؓ متوفی ۵۰ھ	۳۔ امام حسینؓ مقتول ۶۱ھ	محمد بن الحنفیہ
حسن	۴۔ علیؒ (زین العابدین) متوفی ۹۴ھ	ابوہاشم
عبداللہ المحض	۵۔ ابوجعفر محمد باقرؒ متوفی ۱۱۳ھ	بنی عباس نے انھیں کے وصی ہونے
محمد (نفس زکیہ) ابراہیم	۶۔ ابوعبداللہ جعفر صادقؒ متوفی ۱۴۸ھ	کا دعویٰ کرکے خلافت حاصل کی۔
یہ دونوں بھائی خلیفہ منصور پر خروج کرکے مقتول ہوئے۔	۷۔ موسیٰ کاظم متوفی ۱۸۳ھ	
اسماعیل	۸۔ ابوالحسن علی رضا متوفی ۲۰۲ھ	
محمد	۹۔ ابوجعفر محمد جواد متوفی ۲۲۰ھ	
اسماعیل	۱۰۔ علی ہادی متوفی ۲۵۴ھ	
محمد	۱۱۔ ابومحمد حسن عسکری متوفی ۲۶۰ھ	
احمد	۱۲۔ محمد (مہدی منتظر) ۲۶۰ھ میں غائب ہوئے۔	
عبداللہ		
احمد		
حسین		
عبداللہ المہدی بانیٔ دولت فاطمیہ متوفی ۳۲۲ھ		

منصب امامت شیعہ کے مخصوص عقائد کا مرکزی نقطہ امام ہے اس لئے یہاں امام کے متعلق اس جماعت کے عقائد کو نہایت اختصار کے ساتھ مذہب شیعہ کی سب سے معتبر کتاب کافی سے التقاط کرکے لکھتا ہوں جو محمد بن یعقوب کلینی بغدادی متوفی ۳۲۹ھ کی تالیف ہے اور شیعوں میں اس کی صحت و مقبولیت کا وہی درجہ ہے جو سنیوں میں صحیح بخاری کا ہے۔

ابوحمزہ کہتے ہیں کہ امام جعفرؑ نے فرمایا کہ اللہ کی بندگی وہی کرتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہے اور جو معرفت نہیں رکھتا وہ یوں ہی گمراہی سے اس کا پرستار بنا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا کہ معرفتِ الٰہی کیا ہے؟ فرمایا اللہ عزوجل کی تصدیق۔ حضرت علیؓ کی مولات اور ان کی پیروی، ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی پیروی اور ان کے دشمنوں سے اللہ کے سامنے برارت۔ یہ ہے اللہ کی معرفت۔ امام رضا نے کہا کہ جملہ انسان اطاعت میں ہمارے غلام ہیں اور دین میں ہمارے محب۔

امام ابوجعفرؑ نے فرمایا۔ ہم علم الٰہی کے خزانے دار ہیں اور وحی الٰہی کے ترجمان۔ جو لوگ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہیں، ان سب پر ہم اللہ کی حجت ہیں۔

امام رضا سے ایک طویل کلام ائمہ کی توصیف میں مروی ہے جس میں یہ فقرے بھی ہیں: امام گناہوں سے پاک اور عیبوں سے بری ہوتا ہے۔ علم کے ساتھ مخصوص اور حلم کے ساتھ موصوف . . . . لوگوں نے سخت غلطی کی اور جھوٹ گھڑا کہ جان بوجھ کر اہل بیت کو چھوڑا۔ اور اللہ و رسول کے انتخاب کئے ہوئے سے منہ موڑا۔ نسک و زہد، علم و عبادت، قدس و طہارت کے معدن۔ رسول کی دعاؤں میں مخصوص اور بتولؓ مطہرہ کی اولاد۔

امام ابوجعفرؑ نے فرمایا: ہم شجر نبوت ہیں اور رحمت کا گھر، حکمت کی کنجیاں ہیں اور علم کے معدن، رسالت کا موضع ہیں اور ملائکہ کی آمد و رفت کا مقام۔ اللہ کے بندوں کے پاس ہم اس کی امانت ہیں۔ ہم اس کے حرم اکبر ہیں اور ہم اللہ کا ذمہ اور اس کا عہد ہیں۔ جس نے ہمارا عہد پورا کیا اس نے اللہ کا عہد پورا کیا اور جس نے ہمارا عہد توڑا اس نے اللہ کا عہد توڑا۔

ائمہ کے پاس وہ ساری کتابیں ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں اور وہ ان سب کو باوجود زبانوں کے اختلاف کے سمجھتے ہیں۔ پھر اللہ نے ائمہ کو اس کتاب کا وارث بنایا جس میں ہر شے کی تشریح ہے۔ مکمل قرآن سوائے ائمہ کے کسی کے پاس نہیں اور وہ اس کا پورا علم رکھتے ہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے پورا قرآن جمع کر لیا وہ جھوٹا ہے۔ کسی نے اس کو جس طرح پر وہ نازل ہوا نہ جمع کیا نہ حفظ کیا سوائے علی بن ابی طالب اور ان ائمہ کے جو ان کے بعد ہیں۔ ائمہ کے پاس اسم اعظم ہے اور وہ جفر بھی رکھتے ہیں جو چمڑے کا ایک تھیلا ہے جس میں انبیاء اور اوصیاء نیز گزشتہ علماء بنی اسرائیل کے علوم ہیں۔ ان کے پاس مصحف فاطمہؑ ہے جو تمہارے قرآن سے تین گنا ہے اور اس میں، تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کے دو علم ہیں۔ ایک وہ جس کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا اور ایک وہ جس کو اس نے ملائکہ اور انبیاء کو سکھلایا۔ اس کو ہم جانتے ہیں۔

ائمہ جب کسی شے کا علم چاہتے ہیں تو اللہ ان کو بتلا دیتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کب مریں گے اور جب مرتے ہیں تو اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔

جو کچھ ہوا یا ہونے والا ہے ائمہ سب کا علم رکھتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ اللہ نے رسولؐ کو کوئی علم نہیں سکھلایا مگر یہ کہ ان کو حکم دیا کہ امیرالمومنین علیؓ کو سکھلا دیں۔ اسلئے وہ علم میں نبی کے شریک تھے۔ پھر یہ علم ائمہ کو ملا۔

اللہ نے ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی نافرمانی سے منع کیا ہے وہ بمنزلہ رسول کے ہیں بجز اس کے کہ نبی نہیں ہیں۔

ہر امام اپنے بعد آنے والے امام کو کتابیں، علوم اور اسلحہ سپرد کر دیتا ہے اور ائمہ کوئی کام بلا حکم اور بلا عہد الٰہی نہیں کرتے اور اس کے حکم سے ذرا بھی آگے قدم نہیں بڑھاتے۔

اللہ و رسول نے ہر ایک امام کی یکے بعد دیگرے تصریح کر دی ہے۔ ہر امام اپنے بعد کے امام کو امامت سپرد کرتا ہے اور اس کیلئے ایک ملفوف کتاب اور ایک وصیت نامہ چھوڑ جاتا ہے جس میں آدمؑ کی تخلیق سے لیکر فنائے عالم تک جو ضرورتیں پیش آنے والی ہیں سب کا حل ہے۔ امام کے لئے غیبت بھی ہے جب اس کے غیبت کی خبر سنو تو انکار نہ کرو۔ اور بارہویں امام غائب ہیں۔ وہی مہدی ہیں جو روئے زمین کو جب کہ وہ ظلم و ستم سے بھر جائیگی عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

جو شخص امامت کا اہل نہ ہو اور اس کا دعوےٰ کر بیٹھے وہ کافر ہے۔

امام ابو جعفر سے مروی ہے کہ اللہ نے کہا ہے کہ جو رعیت امام ظالم کی تابع ہو گی جو اللہ کی طرف سے نہ ہو اگرچہ اپنے اعمال میں نیک اور پرہیزگار ہوگی میں اس کو عذاب دوں گا اور جو رعیت اسلام میں امام عادل کی تابع ہو گی جو اللہ کی طرف سے ہو، اگرچہ بدکار اور گنہگار ہو گی میں اس سے درگذر کروں گا۔[۵]

امام کو امام ہی غسل (میت) دیتا ہے۔

امام جعفر نے فرمایا: اللہ جب کسی امام کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو عرش کے نیچے سے شربت لیکر اس کو پلاتا ہے۔ وہ چالیس دن تک ماں کے شکم میں کوئی کلام نہیں سنتا۔ جب اس کی پیدائش ہوتی ہے تو وہی فرشتہ جس نے شربت پلایا تھا اس کے دائیں بازو پر آکر لکھتا ہے " وتمت کلمت ربك صدقا وعدلا لا مبدل لکلماتہ" (تیرے رب کا کلمہ سچائی اور عدل کی رو سے پورا ہے اس کو کوئی بدلنے والا نہیں) جس وقت وہ امام اپنے منصب پر پہنچتا ہے اللہ ہر ملک میں اس کیلئے ایک منارہ کھڑا کر دیتا ہے جس کی روشنی میں وہ تمام بندوں کے کام دیکھتا ہے۔

فرشتے اماموں کے گھروں میں آتے ہیں، ان کے فرش پر بیٹھتے ہیں اور ان کے پاس خبریں لاتے ہیں۔ لوگوں کے پاس وہی بات حق ہے جو امام کے ذریعے سے ملی ہو۔ اور جو بات امام کے ذریعہ سے نہ ملی ہو وہ باطل ہے۔

ساری زمین امام ہی کی ہے۔ یہ اہل بیت ہیں جن کو اللہ نے زمین کا وارث بنایا ہے۔

مال غنیمت کا خمس چھ حصوں میں تقسیم کیا جائیگا۔ اللہ۔ رسول۔ قرابت دار۔ یتیمیٰ۔ مساکین اور مسافر۔ ان میں سے پہلے تین حصے امام کے ہیں۔ اس لئے امام کا حصہ خمس میں سے نصف یعنی کل مالِ غنیمت کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔ مال فئے (غنیمت بلا جنگ) نیز جنگل، معدن اور سمندر وغیرہ اکیلے امام کے ہیں۔

---

[۵] اللہ کا یہ قول قرآن میں تو کہیں نہیں ہے۔

میں نے ائمہ اہل بیت کی تعلیمات اور ان کے دعاوی میں سے یہ تھوڑی سی باتیں لی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اقوال کو وہی تسلیم کر سکتا ہے جو ان ائمہ پر ایمان رکھتا ہو ورنہ یہ سب کے سب بلحاظ مستقیم قرآن کے خلاف ہیں اور غالباً اسی احساس کی بنا پر اس قرآن کو جس پر امت ایمان رکھتی ہے ناقص قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور کامل قرآن ائمہ کے پاس محفوظ بنایا گیا ہے۔ پھر اس کے علاوہ مصحف فاطمہ بھی ان کے ہاتھوں میں ہے جو اس قرآن سے تگنا اور تعلیمات کے لحاظ سے بالکل جدا گانہ ہے۔

یہ دعاوی اگرچہ مذہبی رنگ میں ہیں لیکن اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سب کے سب استحقاق خلافت کے سیاسی منصوبے کے ارد گرد چکر کاٹ رہے ہیں اور ان کا اصل مقصود صرف اپنی کھوئی ہوئی حکومت حاصل کرنے کے لئے امت کو ہموار کرنا ہے اور حکومت بھی علی الاطلاق!!

اہل سنت کی نگاہ میں خلیفہ بھی دوسرے انسانوں جیسا انسان ہے۔ انھیں کی طرح پیدا ہوتا ہے، پرورش پاتا ہے اور سیکھتا ہے۔ اس کو دوسرے مسلمانوں پر کوئی فضیلت نہیں سوائے اپنی ذاتی لیاقت کے جس کی وجہ سے اس کا انتخاب ہوا۔ نہ اس پر وحی آتی ہے نہ اس کا تسلط روحانی ہے۔ وہ صرف قانونِ الٰہی کو نافذ کرنے کا مجاز ہے اور اس پر امت کو احتساب کا حق ہے بلکہ غلط روی پر معزول کر دینے کا بھی۔

اور شیعوں کا امام تو اپنی سرشت و فطرت میں انسانوں سے بالاتر ہے۔ ماں کے پیٹ ہی میں عرش کے نیچے سے شربت کا پیالہ پینے لگتا ہے۔ تشریع کا حق رکھتا ہے اس پر تنقید گمراہی ہے۔ اس کا قول و فعل حق و باطل اور خیر و شر کا معیار ہے۔ وہ ایسا روحانی رہنما ہے کہ نماز، روزہ وغیرہ دینی اعمال بھی بلا اس پر ایمان لائے ہوئے بیکار ہیں۔

یہ باتیں قرآن کی حسین و جمیل، سادہ و بسیط، فطرتی و جمہوری تعلیمات کے بالکل متضاد ہیں جو تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد دیکھتا ہے اور نسبی بنیاد پر کسی کو کوئی حق نہیں دیتا، نہ پیدائشی طور پر کسی انسان کی دینی فضیلت کو مانتا، نہ صلاح و تقویٰ کی وراثت کا قائل ہے بلکہ ہر شخص کی قیمت کا مدار خود اس کے ایمان اور عمل پر رکھتا ہے۔ چنانچہ صدر اول کے لوگ ان باتوں سے جو ان ائمہ سے مروی ہیں بالکل نا آشنا تھے۔ خود حضرت علیؓ اور حسینؓ بھی خلیفہ یا امام کے متعلق وہی سادہ نظریہ رکھتے تھے جو اہل سنت کا ہے۔ نہ اس کو معصوم سمجھتے تھے نہ تنقید سے بالاتر۔ چنانچہ اسی کافی میں روایتیں ہیں حضرت علیؓ نے فرمایا: لا تکفوا عن مقالۃ بحق او مشورۃ بعدل فانی لست امن ان اخطی (سچی بات یا انصاف کے مشورہ سے نہ رکو کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں۔)

نیز امام حسینؓ اپنے بھائی امام حسنؓ کی صلح کو جو انھوں نے معاویہؓ کے ساتھ کی تھی ناپسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے لو جز انفی کان احب الی مما فعلہ اخی (اگر میری ناک کاٹ لی جائے تو میں اس کو اس سے بہتر سمجھوں گا جو میرے بھائی نے کیا)

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ جب سے ایرانی اس جماعت میں شامل ہوئے جو اپنے بادشاہوں کے تقدس اور خطا سے

بالاتر ہونے کا خیال رکھتے تھے، اس وقت سے یہ باتیں شیعیت میں داخل ہوئیں۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ جب سے عباسی تختِ خلافت پر آگئے اس وقت سے علویہ میں اپنے حق کے احساس کی تلخی بڑھ گئی اور وہ قرابت قریبہ کی خصوصیت کی بنا پر اپنی فضیلت اور عظمت کو زیادہ زور کے ساتھ پیش کرنے لگے۔ خلیفہ منصور کے نام نفس زکیہ کا خط پہلے آپ پڑھ چکے ہیں[1]۔ اسی زمانے کی دوسری عظیم الشان شخصیت امام جعفر کی ہے۔ انھیں سے بیشتر یہ روایتیں مروی ہیں۔ مگر میرے نزدیک ان روایات کا انتساب ہی ائمہ اہل بیت کی طرف مشکوک ہے۔ کیونکہ شیعہ کی پہلی کتاب یہی کافی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں مدوّن ہوئی۔ اس مدت مدید میں شیعہ راویوں کے لئے ان روایات میں تغیر و تبدل بلکہ اضافہ اور الحاق کا پورا موقع تھا لیکن چونکہ شیعہ ان روایات کو صحیح مانتے اور ان کے اوپر عقیدہ رکھتے ہیں اسلئے تاریخی حیثیت سے مجھکو اپنے کلام کی بنیاد ان کے مسلمات پر رکھنی پڑی ورنہ میں اس کو نظر انداز کر دیتا۔

دیگر شیعی عقائد مہدی منتظر کے عقیدے کی طرف ضمناً اشارہ ہو چکا ہے۔ یہ عقیدہ شیعوں سے پیدا ہوا اور اس کی اتنی اشاعت ہوئی کہ سنیوں میں بھی مقبول ہو گیا۔ اگرچہ بخاری و مسلم جو اہل سنت میں حدیث کی سب سے زیادہ صحیح کتابیں تسلیم کی گئی ہیں مہدی کی روایتوں سے خالی ہیں مگر ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان کو لیا ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ آخری زمانے میں اہل بیت میں سے ایک شخص کا ظہور ہوگا جس کی پیروی ساری امت کرے گی اور وہ اسلامی ممالک پر تسلط حاصل کر کے دین اور عدل پھیلائے گا۔

ان روایات کے اسناد میں بعض بزرگوں خاص کر ابن خلدون نے بسط کے ساتھ کلام کیا ہے اور سب کو ضعیف یا موضوع قرار دیا ہے مگر شیعہ کے یہاں یہ عقیدہ ارکانِ دین داخل ہے۔

بعضوں کے نزدیک اس کا اصلی سبب یہ ہوا کہ کربلا کے حادثے کے بعد جب اہل بیت کی خلافت کی امید منقطع ہو گئی اسوقت رؤسا شیعہ نے اس مایوسی کو دور کرنے اور جماعت کو زندہ رکھنے کے لئے مہدی غائب کا عقیدہ پھیلایا۔ اسی زمانے میں ابوسفیان کی شاخ سے خلافت نکل کر مروان کے ہاتھ میں چلی گئی۔ علویہ کی تقلید میں خالد بن یزید نے جس کو اپنے گھر سے خلافت نکل جانے کا سخت قلق تھا سفیانی کا خیال پیدا کیا یعنی ایک شخص اس خاندان کا ظاہر ہو کر ابوسفیان کی اولاد میں خلافت کو واپس لائے گا۔ یہ روایتیں کتب حدیث میں ہیں۔ عباسیہ نے اپنے دور میں جب دیکھا کہ علوی اور اموی دونوں گھرانوں میں ایک ایک آنے والے مہدی کا خیال ہے تو عباسی مہدی کی روایتیں تیار کرائیں جو طبرانی اور حاکم وغیرہ نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے اسی خیال سے اپنے بیٹے کا نام مہدی رکھا ہو۔ ابوالفرج اصفہانی لکھتا ہے کہ مطیع بن ایاس جو خطباء میں سے تھا اس کی مہدویت کی حدیثیں تراشا کرتا تھا۔ اس طرح پر مسلمانوں کی اکثر جماعتوں میں مہدی کا عقیدہ پیدا ہو گیا جو امت کے لئے ایک زندہ عذاب اور مستقل تعزیر بن گیا۔ سلسلہ وار مدعیانِ مہدویت کھڑے ہونے لگے اور دونوں طرف سے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہنے لگا۔ جہانتک معلوم ہو سکا ہے صرف زیدیہ باوجود اس کے کہ وہ بھی شیعہ ہیں اس عقیدے سے ہمیشہ منکر رہے۔

---

[1] یہ مضمون طلوع اسلام میں شائع نہیں ہوا۔

رجعت قرآن نے اگرچہ صاف صاف تصریح کر دی ہے :-

الم یروا کم اھلکنا قبلھم من القرون انھم الیھم لا یرجعون وان کل لما جمیع لدینا محضرون - (۳۶-۳۱-۳۲)

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے کتنی نسلیں ہم نے ہلاک کی ہیں جو ان کی طرف پلٹ کر نہیں آتی ہیں اور وہ سب کی سب ہمارے پاس حاضر رکھی گئی ہیں۔

مگر شیعہ میں مہدی کے عقیدے کے ساتھ رجعت کا بھی عقیدہ ہے۔ یعنی ظہور مہدی کے بعد حضرت علیؓ، حسنؓ، حسینؓ وغیرہ جملہ ائمہ دنیا میں دوبارہ واپس آئیں گے اور ان کے مخالفین ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و معاویہؓ و یزید وغیرہ بھی لائے جائیں گے اور ان کو سزائیں دی جائیں گی۔ شریف مرتضیٰ نے لکھا ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کو مہدی کے زمانے میں ایک درخت پر سولی دی جائیگی۔

تقیہ یہ بھی امامیہ کے عقائد کا جزو ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنے عقیدہ کو چھپائے رکھنا اور عمل سے اس کے خلاف ظاہر کرنا کہ کسی کو شیعیت کا شبہ نہ ہو سکے کافی میں امام جعفرؓ سے مروی ہے کہ "دین کا ۹/۱۰ حصہ تقیہ میں ہے اور جو تقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے"۔ امام رضا سے کسی نے تقیہ کی بابت سوال کیا۔ فرمایا کہ "تقیہ میرا دین ہے اور میرے باپ دادا کا دین ہے۔ جس میں تقیہ نہیں اس میں ایمان نہیں"۔ کوئی شیعہ سنیوں کے ساتھ نماز پڑھے تو بڑے ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ بعض ائمہ اہل بیت سے مروی ہے کہ جس نے تقیہ سے کسی سُنّی کے پیچھے نماز پڑھ لی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔

بہت سے تاریخی واقعات کو بھی اس جماعت نے تقیہ پر محمول کیا ہے۔ مثلاً حضرت علیؓ نے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمان رضی اللہ عنہم کی بیعتوں میں تقیہ سے کام لیا۔ امام حسنؓ نے معاویہؓ کے ساتھ تقیہ سے صلح کی وغیرہ۔ اسی تقیہ سے بعض شیعہ بظاہر سنی بن گئے اور انھوں نے اپنے کو سُنّی علما مثلاً ابن جریر اور ابن قتیبہ وغیرہ کے ناموں سے مشہور کر کے اپنی روایتیں اہل سنت میں پھیلائیں۔

تبرا شیعہ اپنے عقیدے میں اہل بیت کو خلافت رسول کا حقدار سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ خلفاء ثلاثہ خاص کر شیخین رضی اللہ عنہما کو ظالم اور غاصب قرار دیتے ہیں اور ان سے نفرت اور عداوت رکھتے ہیں اور تبرا کرتے ہیں۔ کافی میں امام جعفر صادقؓ سے روایت ہے کہ "تین قسم کے لوگ ہیں جن سے اللہ نہ کلام کریگا نہ ان کے گناہ بخشے گا بلکہ ان کو دردناک عذاب دیگا۔ ایک وہ جس نے امامت کا دعویٰ کیا اور اس کا اہل نہ تھا۔ دوسرا وہ جس نے اللہ کے متعین کئے ہوئے امام کا انکار کیا۔ تیسرا وہ جو خیال رکھتا ہے کہ ابوبکر و عمر میں اسلام کا کوئی شائبہ بھی تھا"۔

ان کے عقیدے میں سوائے شیعہ کے سارے مسلمان کافر ہیں اور رسول اللہؐ کے بعد بجز چند صحابہ کے (جو حضرت علیؓ کی خلافت کے خواہاں تھے) جملہ صحابہ مرتد ہو گئے۔ انھیں وجوہات سے وہ خلفاء ثلاثہ، نیز ام المومنین حضرت عائشہؓ و حفصہؓ وغیرہ سے تبرا کرتے ہیں اور اس کو قربت و ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کافی کی روایات میں ان حضرات پر لعنت بھیجنے کے لئے خاص خاص ماثورہ دعائیں ہیں۔

جماعت شیعہ شروع میں حضرت علیؓ کی خلافت کے خواہاں جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں چند مخلص اور نیک دل صحابہ تھے۔

پھر رفتہ رفتہ ان کے حامیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ سبائی تحریک نے جس قدر حضرت عثمانؓ کے مخالف پیدا کئے اسی قدر حضرت علیؓ کے طرفدار۔ واقعۂ کربلا سے بھی بنی امیہ کی طرف سے بہت سے دلوں میں نفرت پیدا ہوگئی جو اہل بیت کے حامی بن گئے۔ نومسلم عجمی قومیں جو بنی امیہ کے استکبار و استبداد سے تنگ تھیں اپنی فروتری کو دیکھ کر اس جماعت میں شریک ہوگئیں کیونکہ یہ بنی امیہ کے مخالف تھے۔ ایرانی امراء و رؤسا اس خیال سے ان ائمہ کے حامی ہوگئے کہ ان کے یہاں سلطنت کی وراثت شاہی نسل میں چلتی تھی۔ حکومتِ الٰہی ان کی سمجھ میں نہ آسکی اور انھوں نے رسول اللہؐ کو بھی کسریٰ خیال کیا۔ جن کے بعد ان کی نظر میں ان کی جانشینی کے حقدار صرف ان کے اہل بیت ہو سکتے تھے۔

الغرض مختلف اسباب سے مختلف جماعتیں اس فرقے میں شامل ہوئیں جن میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ابنِ سبا کی طرح اسلام سے انتقام لینے کے لئے محب اہل بیت بن گئے تھے۔

شیعہ پر سختیاں خوارج اور شیعہ دونوں اس بارے میں متفق تھے کہ بنی امیہ اور بنی عباس ظالم اور غاصب ہیں۔ اگرچہ دونوں کی عداوت کے اسباب مختلف تھے۔ خوارج ان کی خلافت کو اس لئے ناجائز سمجھتے تھے کہ وہ حکومتِ الٰہی نہ تھی بلکہ شخصی اور استبدادی سلطنت تھی اور شیعہ اس لئے کہ انھوں نے ان کے ائمہ کا حق غصب کر کے ان کو خلافت سے محروم کر دیا تھا اور خود اس پر قابض ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے دونوں فرقے ان کے دشمن تھے اور ان کے تسلط کو مٹانا چاہتے تھے۔

خوارج اپنے عقیدے کا اظہار کر کے کھلے میدان میں مقابلہ کرتے تھے جس کے باعث خلفاء کو آسانی ہوئی کہ قوت سے رفتہ رفتہ ان کو فنا کر دیا۔ لیکن شیعہ کے پاس تقیہ کا حربہ تھا وہ جب موقع پاتے کھلے میدان میں لڑتے ورنہ تقیہ کے میدان میں روپوش ہو جاتے۔ اس وجہ سے ان کا مٹانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ باوجود تمام سختیوں کے بھی آخر کار یہ زندہ رہ گئے۔ غالباً یہی علت تھی جو ائمہ اہلبیت اپنے معتقدوں کو تقیہ کی سخت تلقین اور تاکید کیا کرتے تھے اور اس کو دین کا ۹/۱۰ حصہ کہتے تھے۔

بنی امیہ نے ابتداہی سے ان پر سختی شروع کی۔ امیر معاویہؓ نے اپنے تمام عمال کو حکم بھیجا کہ "جو شخص حضرت علیؓ اور ان کے اہلِ بیت سے تولّا رکھے یا ان کے مناقب روایت کرے اس کا نام وظائف کے دفتر سے کاٹ دو اور اس کی شہادت ساقط الاعتبار کر دو صرف شیعۂ عثمان کو اپنے پاس آنے دو اور ان کے فضائل میں جو روایتیں بیان کی جائیں ان کو معہ ان کے راویوں کے ناموں کے مجھے بھیجتے رہو۔

کوفہ شیعوں کا مرکز تھا جس کا عامل زیاد تھا۔ وہ چونکہ حضرت علیؓ کے زمانے میں شیعہ رہ چکا تھا اس وجہ سے اس جماعت کے لوگوں سے واقف تھا۔ اس نے جہاں جہاں ان کو پایا قتل کیا۔ اس کے بعد جو کچھ رہ گئے ان کو اس کے بیٹے عبداللہ بن زیاد نے ختم کیا۔ ان دونوں باپ بیٹوں نے ان کو کھجوروں کے درختوں پر لوگوں کی عبرت کے لئے سولیاں دیں، ہاتھ اور پاؤں کاٹے آنکھوں میں سلائیاں پھیریں اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مارا۔ حجاج بن یوسف جب عراق کا والی ہوا تو اس نے بھی وہی

برتاؤ رکھا۔ اس کو کافر یا زندیق سے اتنی نفرت نہ تھی جتنی شیعہ سے تھی۔ عربی کے مشہور ادیب اصمعی کے دادا نے ایک دن اس سے کہا کہ میرے والدین نے میرے اوپر بڑا ظلم کیا۔ اس نے پوچھا کیا؟ بولا کہ میرا نام علی رکھ دیا۔ حجاج مسکرایا اور اس کو ایک ناحیہ کا عامل مقرر کر دیا۔

جملہ اموی عمال کا یہی حال تھا۔ وہ شیعیت کی تہمت پر بھی ہاتھ پاؤں کاٹ لیتے یا قید کر کے مال و متاع ضبط اور مکان منہدم کر دیتے۔

عباسی اور بھی زیادہ اہل بیت کی طرف پُر حذر تھے کیونکہ وہ خود ان کے شریک کار رہ چکے تھے۔ اس وجہ سے ان کے عہد میں شیعوں پر اور بھی سختیاں بڑھ گئیں۔ ابو مسلم خراسانی نے سینکڑوں سپاہی اسی لئے مقرر کر رکھے تھے کہ جہاں کسی شیعہ کو پا جائیں قتل کر دیں۔ عباسی خلفاء میں سب سے زیادہ ان کا دشمن متوکل تھا۔ اس نے امام حسینؓ کی قبر ۲۳۶ھ میں معہ تمام ملحقہ عمارتوں کے منہدم کرا دی جس پر ہل چلا کر کاشت ہونے لگی[1] لیکن باوجود ان تمام سختیوں کے شیعہ اپنے عقیدہ اور عمل سے ہٹے نہیں اور ان کے آخری خلیفہ مستعصم تک کبھی پنہاں کبھی آشکارا مقابلہ کرتے رہے۔

کاش یہ ساری جماعتیں سیاسی مقصد میں متحد ہوتیں اور سنی، خارجی اور شیعہ سب اسلام کو پیش نظر رکھتے اور ایک دوسرے کو مٹانے کی کوشش میں اپنی قوتیں برباد نہ کرتے تو آج اسلام کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ یہ قریشی خانوادوں کی حکومت کا سودا تھا جس نے ہیجان برپا کیا۔ اور ان کی باہمی رقابتوں نے امت کا شیرازہ بکھیرا۔ ورنہ مسئلہ نہایت سادہ اور صاف تھا کہ خلافت کا مدار انتخاب عام پر رکھ دیا جائے۔ شیعہ جو امام منصوص کے قائل ہیں انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اللہ اگر کسی کو ماں کے شکم سے خلافت کیلئے تیار کرتا تو اس کا تخت خلافت پر آجانا لازمی تھا۔ اور جب نہ آسکا تو سمجھنا چاہئے کہ انتخاب جمہور ہی کا حق ہے۔

رعایت کی میعاد ختم

تاریخ رسالت اور معراج انسانیت (معارف القرآن جلد سوم و چہارم)

کی قیمتوں میں رعایت کی آخری تاریخ

۳۱ر دسمبر ۱۹۵۱ء تھی، جواب گذر چکی ہے

لہٰذا اب یہ کتابیں اپنی اصلی قیمت یعنی پندرہ[15] روپے (جلد سوم) اور بیس[20] روپے (جلد چہارم) پر ملیں گی۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام

---

[1] ان مظالم کی تفصیل دیکھنی ہو تو ابوالفرج اصفہانی کی کتاب مقاتل الطالبین اور ابوبکر خوارزمی کے بعض رسائل کا مطالعہ کیجئے۔

مسلم لیگ کی سیاست

قارئین کو اس عنوان سے اچنبھا ضرور ہوگا اور بادی النظر میں یہ بات ہے بھی اچنبھے کی کہ طلوعِ اسلام کو موجودہ مسلم لیگ کی سیاست سے کیا وجہ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اس وقت پاکستانی بساطِ سیاست کی ساری مہرہ بازی مسلم لیگ ہی کی شرمندہ احسان ہے۔ (براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی سہی کیونکہ ہر قسم کی سرگرمیوں کو خواہی نخواہی لیگ ہی سے منسوب کر دیا جاتا ہے) اس لئے لیگی سیاست کے جائزہ لینے کو طلوعِ اسلام کے ادراق میں مداخلت بیجا نہیں تصور کیا جانا چاہئے۔

ہم مسلم لیگ کے سابقہ احوال وظروف کو چھوڑ کر آغازِ سخن اس حرفِ شیریں سے کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کیا۔ چنانچہ وابستگانِ مسلم لیگ آج قیامِ پاکستان کو مسلم لیگ کا کارنامہ قرار دیتے ہوئے یہ دلیل لاتے ہیں کہ ایسی جماعت کو ضرور باقی رہنا چاہیئے جس نے ایسا کارنمایاں سرانجام دیا ہے۔ بلکہ ان کے قول کے مطابق قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کے باقی رکھنے کی ضرورت اور شدید ہو گئی ہے کیونکہ اسی جماعت نے پاکستان حاصل کیا اور یہی اس کا صحیح و کماحقہٗ تحفظ کر سکتی ہے۔ یہ دلیل ایک منطقی مغالطہ ہے۔ اگر اربابِ لیگ خود اس دھوکے میں مبتلا نہیں ہیں، تو وہ یقیناً قوم کو اس میں مبتلا کر رہے ہیں۔ ذرا غور کرنے سے یہ مغالطہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ یہ دعویٰ کہ مسلم لیگ نے پاکستان بنایا صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ یہ مسئلہ ذرا وضاحت چاہتا ہے۔ سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائیگی کہ ابتداءً مسلم لیگ منجملہ دیگر سیاسی جماعتوں کے ایک سیاسی جماعت تھی لیکن جب اس نے اپنا نصب العین پاکستان تجویز کیا اور اپنی جدوجہد کا رخ اس منزل کی جانب موڑا تو ملت اسلامیہ نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا ذریعہ اسی جماعت کو بنا لیا اور حالت من تو شدم تو من شدی کی ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کے بعد جب مسلم لیگ نئے عزائم اور تازہ ولولوں کے ساتھ میدانِ عمل میں آئی تو قائداعظمؒ نے غیر مسلموں سے سیاسی مذاکرات میں ہمیشہ اولیں مطالبہ یہی پیش کیا کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ مطالبہ پاکستان کا یہ اعجاز تھا کہ اس نے مسلمانوں اور مسلم لیگ کو بالکل یک جان بنا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے جو کچھ کیا مسلم لیگ کی معرفت اور مسلم لیگ کے نام سے کیا۔ گویا بالفاظِ دیگر ملتِ اسلامیہ نے حصولِ آزادی کے لئے جو جمعیت تیار کی اسے مسلم لیگ کا نام دیا۔ یہ جمعیت، ملت کا مرکزی ادارہ تھا جو حصولِ پاکستان کے بعد مملکتِ پاکستان میں بدل گیا۔ اب آزادی حاصل کرنے کے بعد ملت اپنے اجتماعی امور کسی سیاسی جماعت کی معرفت سرانجام نہیں دیگی کیونکہ وہ دورِ غلامی کی مجبوری و بے چارگی کی دلیل تھی اب اس کی سرگرمیوں کا منبع و مرکز حکومتِ پاکستان ہے۔ وہی اس کا مرکز ہے اور وہی اس کی سیاسی جماعت۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کیا بدیں وجہ غلط ہے کہ پاکستان درحقیقت ملت کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کہنا کہ مسلم لیگ اب بھی باقی ہے بدیں وجہ غلط ہے

کہ مسلم لیگ بہ حیثیت ایک مرکزی ادارے کے حکومت میں تبدیل ہوگئی۔ اب مسلم لیگ سے مراد حکومت یعنی مرکزِ ملت ہے تو واقعی اس مرکز کی اب بھی ضرورت ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ لیکن یہ کہنا کہ حکومت کے باوجود مسلم لیگ یعنی ایک سیاسی جماعت کی ضرورت ہے، دو عملی کی علامت ہے اور ملت اور مرکز کے باہمی ربط و تعلق سے بے خبری محض کی دلیل۔

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ مسلم لیگ پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے ساتھ ہی کالعدم ہوگئی یا حکومت میں تبدیل ہوگئی، اس امر کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ مسلم لیگ کے بقا و استحکام کا سوال خارج از بحث ہے۔ اصل سوال تحفظ و استحکامِ ملت کا ہے اور اس کا واحد ذریعہ مرکزِ ملت یعنی حکومت ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ بدستور سابق مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرانے پر مصر ہیں وہ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے ملت و مرکزِ ملت کے ربط و اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ملت یا ملی نظام کے کبھی دو مرکز نہیں ہو سکتے۔ اور جب بھی کوئی گروہ اس 'شرک' کا مرتکب ہوا ہے وہ انتشار و خلفشار ہی کا شکار ہوا ہے۔ چونکہ عام مسلمان ایک طرف اس نازک فرق کو سمجھ نہیں سکتے اور دوسری طرف وہ جذباتی واقع ہوئے ہیں، اس لئے ان سے خالصتہً جذباتی اپیل کی جاتی ہے اور قائدِ اعظم کے نام کا واسطہ دیکر مسلم لیگ کے باقی رکھنے کی درخواستیں کی جاتی ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ مسلم لیگ قائدِ اعظم کا ترکہ ہے۔ اول تو یہ کہنا ہی قائدِ اعظم کی توہین ہے، کیونکہ ان کا حقیقی ترکہ پاکستان ہے نہ کہ مسلم لیگ۔ یہی ان کی عمرِ عزیز کا ماحصل تھا، اسی کیلئے وہ مصروفِ جدوجہد رہے اور اسی کے تحفظ میں بقیہ عمر صرف کر دی۔ لہٰذا ان کا ورثہ پاکستان ہے اور قائدِ اعظم سے عقیدت مندانہ وابستگی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پاکستان کو مضبوط و خوشحال بنائیں۔ لیکن اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مسلم لیگ ہی قائدِ اعظم کا ورثہ ہے تو اس طرح تو بے شمار قابلِ وراثت اشیاء انھوں نے چھوڑی ہیں تو ہم کیوں نہ ایسی تمام اشیا کے حقدار و وارث قرار پائیں۔

پھر وضاحت سے سن لیجئے کہ گفتگو کی یہ اساس ہی غلط ہے۔ مسلم لیگ قوم کا ایک چولہ تھا جسے اس نے بدل دیا۔ اب وقت کو پیچھے نہیں لوٹایا جا سکتا کہ پھر اس کرتے کو زیبِ تن کر لیا جائے۔

یہ اسی دو عملی اور 'قومی شرک' کا نتیجہ ہے کہ ملی زندگی میں قدم قدم پر مضحکہ انگیز حرکتیں ہو رہی ہیں۔ مسلم لیگ کے حق میں ایک اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت کے لئے ایک محاسب جماعت کی ضرورت ہے اور مسلم لیگ یہ فریضہ بطریقِ احسن ادا کریگی۔ یہاں بھی اس اصل اساس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ملت اپنے اجتماعی امور و انصرام اہلِ افراد کے سپرد کر کے معطل ہو کر نہیں بیٹھ جاتی بلکہ اس منصرم جماعت (حکومت) کے اعمال کی نگران و محاسب رہتی ہے۔ اس نگرانی اور محاسبے کے لئے وہ کوئی سی آئی ڈی کا محکمہ نہیں قائم کرتی جو کرانا کا تبین کی طرح ان کے اعمال کو لکھتے رہتے ہیں اور پھر پرچہ کاٹ کر کسی کے پیش کر دیتے ہیں بلکہ وہ نظام میں ایسی گنجائش رکھتی ہے جس کے ذریعہ وہ ان منصرمین کا محاسبہ کرتی ہے۔ قرآنی تصور کے مطابق یہ تو اصی کا فریضہ اس خوش اسلوبی سے طے ہوتا ہے کہ کوئی گروہ یہ محسوس بھی نہیں کرتا کہ وہ دوسرے گروہ سے الگ یا مختلف گروہ ہے۔ وہ ایک ہی جسدِ ملت کے اعضا ہوتے ہیں اور اشتراک و تعاون کامل سے ائتلاف سے امور ملی کو سرانجام دیتے جانبِ منزل رواں دواں چلے جاتے ہیں۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ قرآن اس محاسبہ کی کیا صورت پیش کرتا ہے۔ اپنے سیاسین کی سہولتِ فہم کے لئے ہم ان کے اپنے دستور و نظامِ سیاسی سے ہی اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اس وقت

پاکستان کا نظامِ حکومت یہ ہے کہ گورنر جنرل بمعہ کابینہ مجلس دستور ساز کے سامنے جوابدہ ہے۔ یہ مجلس وقتاً فوقتاً اپنے اجلاس منعقد کرتی ہے اور حکومت کی کارگذاری پر بحث و تمحیص کر کے پرانی غلطیوں کی اصلاح کرتی ہے اور آئندہ کے لئے نئی تجاویز عمل پیش کرتی ہے۔ (ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ موجودہ مجلس دستور ساز ایسا کرتی ہے یا نہیں۔ پیش نظر نقطہ کی وضاحت کے لئے اتنا کافی ہے کہ مجلس مذکورہ کا آئینی فریضہ اس قسم کا ہے) گویا یہ مجلس حکومت پاکستان کی محاسب ہے۔ عوام کے نکتۂ نگاہ سے اس مجلس میں دو خوبیاں ہیں ایک یہ کہ یہ کسی نہ کسی طریقۂ انتخاب سے معرضِ وجود میں آئی اور دوسرے یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ طرزِ خیال کے لوگ موجود ہیں۔ بلکہ اس میں غیر مسلم بھی شریک ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ موجودہ اسمبلی پاکستان کے عوام کی صحیح نمائندہ ہے بلکہ اس میں یہ گنجائش ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ متفرق خیال کے گروہوں کا نمائندہ بنایا جا سکتا ہے۔ نیز اس مجلس کو یہ آئینی حیثیت بھی حاصل ہے کہ حکومت اس کے سامنے جوابدہ ہے اور اس کے مشوروں پر عمل کرنے پر ایک حد تک مکلف بھی۔ تو گویا جہاں تک حکومت کے محاسبے کا تعلق ہے اس فریضہ کو مجلس دستور ساز بطریق احسن پورا کر سکتی ہے اور اسی قسم کا محاسبہ مفید و موثر بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایک سیاسی جماعت کا محاسبہ خوش خیالی سے زیادہ وقیع نہیں۔ بلکہ وہ بداہتاً غیر ضروری ہے۔ کیونکہ جب حکومت کی نگران و محاسب جماعت یعنی مجلس دستور ساز موجود ہے تو ایک سیاسی جماعت کس مرض کی دوا ہوگی؟ اگر مقصد محاسبہ ہے تو وہ تو پورا ہو رہا ہے۔ ہاں اگر یوں کیا جائے کہ حکومت کی محاسب جماعت مجلس دستور ساز ہو اور اس کی محاسب جماعت کوئی اور۔ مثلاً مسلم لیگ۔ تو شاید ایک بات بھی ہو۔ لیکن اس صورت میں مسلم لیگ ہی کو آخری محاسب کیوں تسلیم کیا جائے؟ کیوں نہ اس پر بھی محاسبہ کیا جائے، اور اس پر بھی اور اس پر بھی۔ وقس علیٰ ہذا۔ اگر اس طرح محاسبہ در محاسبہ شروع کر دیا جائے تو نظام حکومت ایک پولیسی نظام بن کر رہ جائیگا جسے کوئی بھی پسند نہیں کریگا۔

مسلم لیگ کی یہ دلیل کہ حکومت کے محاسبہ کے لئے (مجلسِ دستور ساز کے علاوہ) ایک سیاسی جماعت کی ضرورت ہے، علمی اور عقلی اعتبار سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اعتراض دراصل مسلم لیگ پر ہی وارد نہیں ہوتا بلکہ مغربی تصورِ جمہوریت پر وارد ہوتا ہے جس کی اساس احزابی (پارٹی) طرزِ حکومت پر ہے۔ یہ طرزِ حکومت اپنے گہوارۂ یورپ بالخصوص برطانیہ میں بھی ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی ناکامی کی یہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ زمانۂ امن میں تو اس سے جوں توں کر کے کام چلا لیا جاتا ہے لیکن جونہی جنگ کے غیر معمولی حالات پیش آتے ہیں یہ سارا سسٹم معطل ہو جاتا ہے۔ برطانیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں پارٹی سسٹم کے مطابق حکومت ہوتی ہے بلکہ وہیں اس پارٹی طرزِ حکومت کی مناسب و بہتر مثال میسر آ سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود گذشتہ جنگ میں جب انگریز قوم ہنگامی حالات سے دوچار ہوئی تو یہ قبا اس کے قالب پر راست نہیں رہ سکی اور اس نے بلا تکلف اسے بالائے طاق رکھ دیا۔ واضح رہے کہ زمانہ امن میں تو ہر نظام اپنے پرانے زور پر چلتا جاتا ہے بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ اس کی راہ میں کوئی موانعات نہیں ہوتے لیکن اس کی آزمائش ہنگامی حالات ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس نظام کو دیکھا گیا ہے کہ ہنگامی حالات میں آزمائش آ پڑنے پر یہ طرزِ حکومت ناکام ہو گیا۔ محض برطانیہ پر ہی کیا موقوف ہے زمانۂ جنگ میں اکثر و بیشتر ممالک میں ایسا ہوا۔ فلہٰذا جو طریقِ حکومت حیاتِ قومی کے نازک مرحلوں میں کام نہ آ سکے اس کی افادیت پر کیسے ایمان

لایا جاسکتا ہے۔ برطانیہ کے حالات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو اس نظام کی از کار رفتگی اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے انتخابات نے حزب عمال (لیبر پارٹی) کو مسند حکومت پر متمکن کیا لیکن پارلیمان میں انھیں کوئی نصف درجن ارکان کی اکثریت حاصل ہو سکی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عمال اور قدامت پسند ملی مسائل کو گلدستہ طاق نسیاں بنا کر کلیتہً جنگ اقتدار میں منہمک ہو گئے۔ اٹیلی، سابق وزیر اعظم نے دیوانہ وار کوششیں کیں کہ ان کی وزارت محفوظ رہے۔ اور چرچل پارٹی نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا کہ حکومت لیبر کے قبضے سے نکل کر ان کے قبضے میں آجائے۔ اس باہمی جدال نے ایک سال کے اندر ہی نئے انتخابات ناگزیر کر دیئے۔ نئے انتخابات بدیں وجہ منعقد کرائے گئے کہ کسی ایک پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہو جائے تاکہ وہ ملک اور قوم کے لئے کچھ کام کر سکے۔ اگر چرچل جیسا محب وطن اور آزمودہ کار انگریز اپنی ساری کوششوں کا محور اسی ایک نقطے کو بنا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریق سے مخالف جماعت کو نیچا دکھائے اور اس کی بجائے خود حکومت حاصل کرے تو تا بدیگراں چہ رسد۔ چنانچہ جب نئے انتخابات منعقد ہوئے تو انگلستان کے سامنے کوئی اصول یا اہم مسئلہ انتخاب نہیں تھا، نہ عام رائے دہندوں کا مقصود کسی خاص سیاسی جماعت کی شکست و فتح تھا۔ بلکہ وہ اس بات کے متمنی تھے کہ جو حکومت بھی بنے وہ نمایاں اکثریت کی مالک ہو تاکہ وہ دیرپا ثابت ہو سکے اور شکست کے غم سے محفوظ رہ کر ملک کے لئے کچھ کر سکے۔ مبصرین جانتے ہیں کہ جن ووٹروں نے چرچل کو یا ان کے خلاف ووٹ دیئے، ان میں سے بیشتر نہ قدامت پسند تھے نہ وہ لیبر ہی سے اتفاق رکھتے تھے۔ درحقیقت انھیں اس سے اتنا سروکار نہیں تھا کہ کون برسر اقتدار ہوتا ہے جتنا اس سے تھا کہ اسے کتنی اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ انگلستان کے نئے انتخابات دبی زبان سے اعتراف ہیں اس حقیقت کا کہ پارٹی طرز حکومت ناکام ہو چکا ہے۔ مگر

بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

ان نظائر کے باوجود ہم بغرض استدلال یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلم لیگ کی اب بھی ضرورت ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کے لئے کہ جو تجربہ ممالک یورپ میں ناکام ثابت ہو رہا ہے وہ پاکستان میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے، ہمیں مسلم لیگ کے عمل کو دیکھ کر استنباط نتائج کرنا ہوگا۔ مسلم لیگ کا عمل ہی مسلم لیگ کے دعوے کی محک ہو سکتا ہے۔ جب یہ فرض کر لیا جائے کہ مسلم لیگ کی ضرورت ہے اور اسے باقی رہنا چاہیئے تو یہ آرڈیننس نافذ کر دینا ہوگا کہ مسلم لیگ کے علاوہ کوئی اور سیاسی جماعت تشکیل پذیر نہیں ہو گی (جیسا کہ ترکی میں ہوا کہ وہاں ابتداءً ایک پارٹی کے علاوہ دوسری پارٹی بن ہی نہیں سکتی تھی) ورنہ ایک برسر اقتدار جماعت کا وجود کم از کم ایک حزب مخالف کے وجود کو مستلزم ہے۔ اور جب ایک سے زائد جماعتوں کی گنجائش رکھ دی جائے تو پھر ان کی تعداد پر کوئی تحدید نہیں لگائی جا سکتی۔ ایسی صورت میں متعدد احزاب سیاسی کا معرض وجود میں آنا بالکل قدرتی اور قابل فہم ہے۔ اور جب متعدد جماعتیں ہوس اقتدار میں ڈوبی ہوئی میدان سیاست میں آجائیں گی تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس قسم کی فوضویت کا دور دورہ ہو جائے گا۔ مسلم لیگ نے اس فوضویت کو اپنے مخصوص حربوں سے پیدا ہونے سے ضرور روکا ہے، لیکن اس نے قوم میں ایسا استبداد روا رکھا کہ بزم سیاست بالکل سونی ہو کر رہ گئی۔ مثلاً ایک طرف تو اس نے اس آمریت سے

گریز کیا کہ اپنے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں پر قانونی پابندی لگا دے، لیکن دوسری طرف اس نے عملاً کوشش کی کہ کوئی سیاسی جماعت اس کی حریف نہ ہو سکے۔ چنانچہ گو قانوناً جماعت سازی جرم نہیں تاہم ہنگامی قوانین اور داروگیر کے ذریعہ اس نے مخالفت کو بالکل کچل کر رکھ دیا ہے۔ بلکہ اب تو اس استبداد کی یہ صورت ہو گئی ہے کہ اپنی جماعت کے جو افراد جماعتی اعمال و کوائف پر نکتہ چینی کی جرأت کرتے ہیں ان کو بھی خار راہ کی طرح راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اس طرح اب مسلم لیگ چند افراد کی مفاد پرستانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے تمام اعضا جنگ اقتدار کے شکار ہیں اور اسی کے دم سے اس بے روح جسد میں زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

اس جماعت کے کارناموں کا سرسری جائزہ تفہیم مطالب کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا مرکز سے کیجئے۔ آغازِ ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کی صدارت میں مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ سرکاری عہدیدار، وزراء وغیرہ لیگ کے عہدیدار نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قائداعظم صدارت کے عہدے سے دستکش ہو گئے، لیکن بعد میں اس آئینی شق کو منسوخ کر دیا گیا اور لیاقت علی خاں مرحوم کو وزیراعظم ہوتے ہوئے صدر منتخب کر لیا گیا۔ ان کے بعد نئے وزیراعظم کی نظر اس خالی نشست پر پڑی لیکن خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کے رکن نہیں رہے تھے، اس لئے یہ دشواری پیش آئی کہ انہیں کیسے صدر منتخب کیا جائے کیونکہ آئین کی رو سے تو صدر کے لئے لیگ کا ممبر ہونا ضروری ہے۔ اس مشکل کا حل بڑی آسانی سے یوں مل گیا کہ جس آئینی شق نے پابندی عائد کی تھی، اسے ہی منسوخ کر دیا گیا اور اس طرح وزیراعظم پاکستان کے لئے صدارت کا راستہ صاف ہو گیا۔ یوں تو آئین کوئی ایسی ناقابل تبدیل شے نہیں کہ مصلحت وقت کے مطابق اسے بدلا نہ جا سکے لیکن موجودہ حالات میں مسلم لیگ کا آئین ایسی موم کی ناک بن گیا ہے کہ اسے جس قالب میں چاہیں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اور اس کا ڈھال لیا جانا اس حد تک مسلم ہے کہ (سنا گیا ہے کہ) جب خواجہ ناظم الدین صاحب کی صدارت کے لئے راستہ صاف کیا جا رہا تھا تو ساتھ ساتھ ہی ان کی صدارتی تقریر حکومتِ پاکستان کے محکمہ اطلاعات کی طرف سے 'سائیکلوسٹائل' ہو رہی تھی اور ریڈیو والے اس کا ریکارڈ بھی تیار کر رہے تھے۔ (یعنی انتخاب سے پہلے ہی یہ معلوم تھا کہ صدر وہی ہوں گے) چنانچہ جب مسلم لیگ کا وہ اجلاس منعقد ہوا جس میں خواجہ صاحب کو صدر چنا جانا تھا تو (کہتے ہیں کہ) سرکاری ذرائع سے تیار شدہ صدارتی تقریر پہلے سے موجود تھی اور اسے سرکاری ذرائع سے ہی اجلاس میں تقسیم کرایا گیا اور اسی شام کو اس تقریر کا ریکارڈ ریڈیو پاکستان سے سنایا گیا۔

مرکز سے 'صدارت و وزارت' کی وحدت کی رو جو چلی تو وہ صوبوں کو بھی لے ڈوبی۔ چنانچہ اس وقت نہ محض وزیراعظم پاکستان ہی مرکزی مسلم لیگ کے صدر ہیں بلکہ صوبائی وزرائے اعظم بھی صوبائی لیگوں کے صدر بن گئے ہیں، اور اس طرح 'جماعت' اور 'حکومت' کی وحدت کے پرفریب پردے میں ایک ہی شخص کو دونوں پر مسلط کر کے دونوں کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ جب مسلم لیگ نے اپنے عہدیداروں کو وزارتیں قبول کرنے سے منع کر دیا تھا تو پنجاب کے موجودہ وزیراعظم دولتانہ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ انہیں وزارت کی مطلق ہوس نہیں، بلکہ ان کے لئے عزت کا آخری درجہ جماعت کی صدارت ہے۔ لیکن جب مسلم لیگ کی سیاست نے

کروٹ لی اور حکومت اور پارٹی کے دونوں دروازے ارکان جماعت کے لئے کھل گئے تو دولتانہ صاحب اس آخری نقطۂ عزت پر پہنچ کر اطمینان سے نہیں بیٹھ سکے اور انھوں نے صدارت و وزارت دونوں پر قبضہ جمالیا۔ اس میں دولتانہ کی خصوصیات نہیں، تمام صوبوں میں یہی کچھ ہوا۔ اس وحدت کمان سے جماعت اور حکومت کی سرحدیں مل گئی ہیں اور جماعت حکومت کا زینہ بن گئی ہے۔ اس سے جماعت کی دلکشی اور بڑھ گئی ہے۔ ایک طرف حکومت پر متمکن گروہ اپنے اقتدار کو جمہوری رنگ دینے کے لئے جماعت باقی رکھنا چاہتا ہے کیونکہ جماعت اس کے اعمال سیاہ پر ایک پردے کا کام دیتی ہے، اور دوسری طرف وہ ناکام آرزو، جنھیں ہوس اقتدار کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی، جماعت کو اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ بام حکومت پر پہنچنے کا یہی واحد زینہ ہے۔ گویا اس وقت جماعت میں جو چمک دمک نظر آتی ہے، وہ جماعت کی حقیقی چمک نہیں بلکہ وہ چاند کی طرح کسی سے مستعار ہے۔ اندریں حالات جب جماعت کے ارکان حکومت کے عہدوں پر ٹکٹکی لگائے بیٹھے ہوں، وہ عہدیداران حکومت پر تنقید کیسے جرأت کر سکتے ہیں۔ وہ تو الٹا اُن کی خوشامد کریں گے کیونکہ اس تملق پیشگی سے وہ ان کی عنان کرم اپنی طرف منعطف کرا سکیں گے (اور اگر کوئی تنقید کریگا تو وہ بھی اس غرض سے کہ ترغیب سے نہیں تو ترہیب (ڈرانے) سے اپنا کام نکالے) اس طرح جماعت محاسب بننے کے بجائے حکومت کی حاشیہ نشین بن کر رہ گئی ہے اور اس کا کام یہی رہ گیا ہے کہ حکومت کے سارو بار پر تحسین و آفریں کہے اور "بایں بہانہ مگر خود دراز کنم" کی مصداق ہو۔

ارباب لیگ ان صریح حقائق سے کس حد تک آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ یا وہ کس دلیری سے قوم کو دھوکہ دے رہے ہیں؟ اس کا اندازہ ممتاز دولتانہ کے ایک حالیہ بیان سے ہوگا جس میں کہا گیا ہے:

> میں مسلم لیگ کو اسقدر مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ دیکھے کہ وزارت اس کے حکم کی تعمیل نہیں کر رہی ہے تو وہ اس وزارت کو نکال باہر کر سکے اور اس کے بجائے ایسی اور وزارت مرتب کرا سکے جو اس کے حکم کے تابع ہو۔ (لاہور-۱۶ دسمبر)

کتنے حسین اور جمہوری الفاظ ہیں! کون ان کی صداقت سے انکار کریگا؟ لیکن مسلم لیگ کی مخصوص سیاست کے پس منظر میں ان کی معنویت کچھ بھی نہیں۔ یہ ایک جمہوری مغالطہ ہے جس میں قوم کو مبتلا کیا جا رہا ہے اور بس۔ اول تو خیر سے مسلم لیگ نے نہ کوئی واضح نصب العین سامنے رکھا ہے اور نہ کوئی صاف لائحہ عمل طے کیا ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کوئی وزارت لیگ کی ہدایت اور پروگرام کے مطابق مصروف کار ہے یا نہیں۔ لیکن اگر بالفرض ایسا نصب العین اور لائحہ عمل موجود بھی ہو اور یہ پتہ بھی چل جائے کہ اس پر یا اس کے مطابق عمل نہیں ہو رہا تو ہوگا کیا؟ مثلاً پنجاب میں ایسی کاروائی عمل میں لائی جائے تو صدر مسلم لیگ، دولتانہ صاحب، مسلم لیگ کا اجلاس طلب فرمائیں گے جس میں دولتانہ صاحب وزیراعظم سے جواب طلب کیا جائیگا۔ اور ملزم جج بن کر اپنے مقدمے کا آپ فیصلہ صادر کریگا کہ اسے یعنی

مجھے بیک بینی و دو گوش وزارت سے نکال دو اور اس کی یعنی میری بجائے کسی غیر کو کرسئ وزارت پر فائز کر دو!

مسلم لیگ کے بازارِ سیاست میں متاعِ امانت کس حد تک میسر آسکتی ہے؟ اس کا اندازہ صوبہ سرحد کے انتخابات سے لگایا جا سکتا ہے جن میں صوبائی لیگ کے صدر اور صوبائی حکومت کے وزیر اعظم عبدالقیوم نے جمہوریت ہی کی نہیں، انسانیت کی بھی خوب ہی مٹی پلید کی۔ انتخابی جنگ کی تیاریوں میں لیگ کی تمام دورمار توپوں نے حصہ لیا۔ مشرقی پاکستان کے وزیر اعظم۔ نورالامین۔ اپنے صوبے کو قحط اور موت کے منہ میں چھوڑ کر بھاگے بھاگے سرحد پہنچے اور مسلم لیگ کے لئے یوں ووٹ طلب کئے کہ اگر مسلم لیگ کھمبے کے لئے بھی ووٹ مانگے تو اپنا ووٹ کھمبے کو دیدو۔ مخالفین لیگ متعجب ہیں کہ نورالامین نے یہ کیا کہہ دیا۔ لیکن بہ نظرِ غائر دیکھنے سے کوئی وجہ تعجب باقی نہیں رہتی کیونکہ پارٹی میں ارکان کی انفرادی خوبیاں یا خامیاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور نمایاں حیثیت جماعت کو حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ووٹ افراد کے نام پر نہیں بلکہ جماعت کے نام پر طلب کئے جاتے ہیں اور ووٹ دینے والوں کو یہ موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ وہ افراد کی سیرت و کردار کا بھی جائزہ لے سکیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ افراد بھرے مجمعوں میں اپنی خامیوں کا اعتراف کرتے سنائی دیتے ہیں لیکن ان کی [illegible] پر وثوق ہے کہ 'میں مسلم لیگ کا ادنیٰ خادم ہوں' اور مسلم لیگ میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔

خود وزیر اعظم پاکستان نے جذبات سے لبریز تقریر کی۔ انھیں ایسے کرنا ہی چاہئے تھا کیونکہ وہ چند دن پیشتر لیگ کے صدر اعظم "منتخب" ہو چکے تھے۔ انھوں نے جماعت اور حکومت دونوں کو سراہا اور مسلم لیگ کے حق میں ووٹ کو پاکستان کے استحکام و ترقی کے لئے ووٹ کا مرادف قرار دیا۔ عبدالقیوم خاں۔ کہ انھیں ذاتی فتح و شکست کا معرکہ درپیش تھا۔ ایک قدم اور آگے بڑھے اور یہاں تک کہہ گئے کہ مسلم لیگ کو ووٹ دینا پختونستان کے پروپیگنڈے کو جھوٹا ثابت کرنا ہے۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ کے برخلاف ووٹ طلب کرنے والے یا برخلاف ووٹ دینے والے تمام کے تمام پختونستان کے حامی ہیں۔ قیوم اس قسم کی الزام تراشی اور دشنام دہی بڑی آسانی سے کر سکتا تھا کیونکہ صوبائی حکومت اس کے اپنے ہاتھ میں تھی اور مرکزی حکومت صدر مسلم لیگ کے قبضہ میں۔ پشاور سے کراچی تک کون اس سے بازپرس کرنے والا تھا؟ اور مخالفین لیگ؟ کوئی جیل کے اندر، کوئی سیفٹی ایکٹ کا شکار، کوئی پشاور بدر، کوئی سرحد بدر۔ وہ دم ماریں تو غدار کہلائیں اور دار و گیر کا شکار ہوں۔

ان حالات میں سرحد کے انتخابات شروع ہوئے۔ وحدت کمان نے خوب ہی گل کھلائے۔ قیوم کو اپنا راستہ صاف کرنا تھا۔ وہ حکومت کا اثر و دبدبہ لے کر میدان میں آیا اور اپنے حریفوں کا ایک ایک کر کے سر کچلا۔ لیگ اور حکومت اس کی ذات میں جمع ہوگئی تھیں اور وہ ان دونوں سے بلند ہو گیا تھا۔ لہٰذا حریف سے مراد وہ شخص تھا جو مجموعہ جماعت و حکومت کا حریف تھا۔ اپنے آدمیوں میں ٹکٹ بانٹے گئے اور ان مسلم لیگیوں کو ان سے محروم رکھا گیا جو جماعت سے وابستہ تو تھے مگر قیوم کے حریف تھے۔ منجملہ دیگر حضرات کے ان میں آل پاکستان مسلم لیگ کا جنرل سکرٹری یوسف خٹک بھی تھا۔ قیوم نے اسے ٹکٹ نہیں دیا۔ خٹک کی اپیل مرکز تک پہنچی۔ مرکز نے اسے قبول کر لیا اور ٹکٹ عطا کر دیا۔ قیوم نے خٹک کے مقابلے میں، جسے اس کی جماعت کے مرکز نے نامزد کیا تھا، ایک غیر لیگی کو کھڑا کر دیا اور اسے کامیاب کرا دیا۔ انتخاب کے دوران میں اپنے مرکز کے امیدوار کو اس نے اس طرح سے پریشان کیا کہ اسے

انتخاب سے دست بردار ہونا پڑا۔

ضمناً یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس استبداد و تظلم کے باوجود مخالفین لیگ نے لیگ سے کچھ زیادہ نہیں تو برابر کے ووٹ ضرور حاصل کئے۔ قیوم خاں سے تو یہ پوچھنا بیکار ہے کہ کیا آدھا صوبہ سرحد جس نے لیگ کے خلاف ووٹ دیئے پختونستان کا حامی ہے؟ لیکن ہم صدر پاکستان مسلم لیگ سے ضرور ایک دو سوال پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ہر پاکستانی سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ اپنا ووٹ مسلم لیگ کو دے۔ لیکن آپ کا صدر و وزیر اعظم صوبہ سرحد کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے ان مسلم لیگی امیدواروں کو شکست دلوائی جنھیں مرکز نے نامزد کیا تھا، اور ان کے مقابلے میں غیر لیگیوں کو کامیاب بنایا؟ کیا یہ لیگ دشمنی نہیں؟ کیا یہ لیگ کے ضابطہ کے خلاف نہیں؟ ذرا اپنے جنرل سکریٹری یوسف خٹک سے پوچھئے کہ وہ قیوم خاں کی کارستانیوں اور انتخابات کی آزادی کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ انھوں نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ انتخابات کو منسوخ کرا کے دم لیں گے۔ ایک مقامی مسلم لیگ کا اپنی وزارت پر تنقید کرنا تو ایک طرف، کیا مرکزی مسلم لیگ اپنی صوبائی شاخ سے باز پرس کرنے کی جرأت کر سکتی ہے؟ اگر کر سکتی ہے تو وہ کس موقع کے انتظار میں ہے؟ اگر نہیں کر سکتی تو وہ قوم کو کیوں دھوکہ دے رہی ہے؟

لیکن نہیں اس میں اچنبھے کی بات نہیں۔ قیوم کی تعدی و تظلم مذمت کے قابل نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی شاندار فتح ہوئی ہے اور مسلم لیگ کی وزارت دوبارہ بن گئی ہے۔ اگر جمہوریت کا خون ہوا ہے، اگر انسانی اقدار کو پامال کیا گیا ہے، اگر افراد کو کچلا گیا ہے، تو کوئی بات نہیں۔ ان کا نتیجہ حسب خواہ نکلا ہے۔ فہو المراد۔ قیوم جماعت کی اس کمزوری کو سمجھتا ہے۔ مرکز نے خود مثال قائم کر کے اس کے ہاتھ میں دودھاری تلوار دیدی ہے۔ اب وہ صوبے کے سینے پر بھی چڑھا ہے اور مرکز کو بھی آنکھیں دکھا رہا ہے۔ مرکز اپنی جگہ پر مجبور ہے کہ اس کی پشت پر ہاتھ رکھے اور اسے خوش رکھے۔

"بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم"

یہ کچھ سرحد ہی پر موقوف نہیں۔ پنجاب میں بھی انتخابات ہو چکے ہیں جہاں ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ پیسے اور پولیس نے مسلم لیگ کو کامیاب بنا دیا۔ انتخابات سے پیشتر پنجاب میں جو ہڑبونگ مچی تھی، اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ اس وقت سندھ میں آئین و سیاست کو جس طرح ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے۔ بلوچستان اور مشرقی پاکستان ان سے بہتر نہیں۔ مسلم لیگ پاکستان کو ایک خطرناک وادی میں لے آئی ہے۔ چند آدمی اقتدار و دولت کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ان کے قدموں کے نیچے نادار، بھوکے، ننگے، مریض، جاہل عوام خاک میں لوٹ رہے ہیں۔

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں　　خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے

بزم سیاست میں مردنی چھائی ہوئی ہے۔ جہاں تک نام نہاد جمہوری اداروں کا تعلق ہے وہ معطل و بے کار پڑے ہوئے ہیں۔ قوم سیاسی پارٹیوں سے بھی بددل ہے اور حکومت سے بھی نالاں ہے۔ قوم کی قوت فکر معطل ہو چکی ہے اور قوائے عملیہ مضمحل۔

انھیں زندگی اور اس کے حقیقی ہنگاموں سے دلچسپی نہیں رہی۔ اس قبرستان میں بھی قیامت آئے گی کبھی؟

اگر یہ درست ہے کہ

ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت

تو قیامت کا اس سے زیادہ موزوں وقت اور کونسا ہو سکتا ہے؟

اس صورتِ حالات کا علاج صرف ایک ہے جسے وہ طلوع اسلام جو اپنی نشاۃِ اولیٰ کے زمانے میں مسلم لیگ کا سب سے بڑا حامی تھا، چار برس سے مسلسل دہراتا چلا جا رہا ہے۔ وہ علاج یہ ہے کہ

(i) مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اور اس کا وجود، ملت میں تشتت و افتراق کا موجب ہے۔

(ii) مسلم لیگ کو ختم کرنے کے بعد، ملک میں پارٹیاں بنانے کو قانوناً جرم قرار دیدیا جائے تاکہ ملک اس لعنت سے پاک ہو جائے۔

(iii) اس کے بعد پوری کی پوری امت ایک جماعت (پارٹی) بن جائے گی۔ اس ایک جماعت (امتِ واحدہ) کے حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کے جذبے کی نشوونما کی جائے۔

(iv) ساری ملت کی اس طرح از سرِ نو تنظیم کی جائے کہ قوم کو چھوٹی چھوٹی وحدتوں (Units) میں تقسیم کیا جائے اور ان میں باہمی مشاورت سے نیچے سے لے کر اوپر تک حکومت کے تمام اداروں کو آزادانہ انتخاب سے پُر کیا جائے۔

اس طرح ملک سے پارٹی بازی کی لعنت ختم ہو کر صحیح نمائندہ حکومت کی طرح پڑ جائے گی۔

اگر یوں کیا گیا تو

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

باب المراسلات

پولیس کے ایک جلسۂ میلاد میں مجھے بلایا گیا، میرے ساتھ دیوبند کے تعلیم یافتہ ایک نوجوان تھے۔ ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو دیکھا پولیس کے چھوٹے، بڑے افسر اور ملازمین جمع ہیں۔ نعت خوانی شروع ہے۔ ایک پنجابی نعت خواں کی نعت کا ایک شعر آپ بھی سنئے۔ مسدس حالی کی بحر میں۔

خدا جس نوں پکڑے، چھڑائے محمدؐ محمدؐ دے پکڑے چھڑا کوئی نہیں سک دا

یعنی خدا کی گرفت سے تو محمدؐ چھڑا سکتے ہیں، لیکن محمدؐ کی گرفت سے چھڑانے کی طاقت کسی میں نہیں۔

میرے سامنے قرآن مجید کی آیہ ذیل آ آ کر ڈرا رہی تھی:

اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِی النَّارِ

(اے پیغمبر!) جو شخص آگ میں ہے کیا تو اسے چھڑا لے گا؟

اگر خدائے نباشد زبندۂ خوشنود شفاعتِ ہمہ پیغمبراں ندارد سود

ایک مسلمان کلام اللہ کی توہین کر رہا ہے اور سامنے بیٹھے ہوئے مسلمان ہی مرحبا، جزاک اللہ کے نعرے لگا رہے ہیں۔

اس کے بعد ایک افسر صاحب تقریر کے لئے آگے بڑھے۔ انھوں نے چند منٹ انکسار میں صرف کئے، پھر مقررانہ انداز میں اصل موضوع شروع کیا۔ دورانِ تقریر میں ہر دو چار منٹ کے بعد فرماتے "درود پڑھو"۔ حاضرین آہستہ پڑھتے تو آپ فرماتے "بلند آواز میں پڑھو"۔

آپ کی پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کے تمام نکات میرے لئے بالکل نئے حقائق تھے۔ اس لئے میں نے ان نوادر کو قلمبند کر لینا مناسب سمجھا تاکہ مجھ ایسے بہت سے ناواقفانِ اسرار مستفید ہو سکیں۔

محترم مقرر نے فرمایا:

آج معشوقِ قدرت کی ظاہری دنیا میں تشریف آوری کا دن ہے۔ ویسے تو آپ اس وقت بھی موجود تھے جب آدم کا پتلا پانی اور مٹی سے جدا نہیں ہوا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بادشاہ کی آمد سے پہلے سپاہی محل ورود کا معائنہ کرنے کے لئے آتے ہیں، پھر بڑے افسر آخر میں پائیلٹ آتا ہے۔ یہ سب تیاریاں اور احتیاطیں بادشاہ کی عظمت و شان کے مطابق سرانجام دی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضور معشوق قدرت کی آمد سے پہلے آدم علیہ السلام کی بعثت سپاہی کی حیثیت رکھتی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا کہ جاؤ اور دیکھ کر آؤ کہ دنیا ہمارے معشوق کے استقبال کے لئے آراستہ ہے یا نہیں؟ آدمؑ کے دو بیٹوں میں کشت و خون کا

واقعہ ہوا۔ زمین خون کے دھبوں سے داغدار ہوگئی۔ معشوق قدرت کی آمد رک گئی۔ آخر نوح علیہ السلام تشریف لائے اور کئی ہزار[1] سال اسی کوشش میں لگے رہے، یہانتک کہ ساری زمین کو طوفان نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طرح ہابیل کے خون کے دھبے صفحۂ ارض سے دور ہوئے۔ لیکن اب زمین ویران اور بے رونق تھی اس وجہ سے معشوقِ قدرت کی تشریف آوری مناسب نہ سمجھی گئی۔ اس بے رونقی دور کرنے کے لئے سوارانِ کشتی کی نسل کو ترقی دی گئی۔ اس دوران میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور ہوا انھوں نے آگ کو گلزار بنایا تاکہ معشوق قدرت تشریف لائے تو اس گل و گلزار سے لطف اندوز ہو۔ "درود پڑھو"[2]

سب کے بعد عیسیٰ علیہ السلام پائیلٹ کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اب زمین عروس نو کی طرح معشوق قدرت کے لئے آراستہ ہو چکی تھی اور سراپا انتظار ہو رہی تھی۔ اس اضطراب دید کی حد یہ ہے کہ عیسیٰؑ کی ولادت کے لئے نہ باپ کی راہ دیکھی گئی اور نہ ان کی وفات کے لئے ملک الموت کا انتظار کیا گیا۔ ان لگے بندھے قاعدوں کو توڑ پھوڑ کر معجزانہ طور پر دنیا میں تشریف لے آئے اور خارقانہ انداز سے ایک ہی جست لگا کر چرخ چہارم پر جا بیٹھے اور اپنے بھیجنے والے کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ "درود پڑھو"

اس تمام بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بازار کائنات صرف معشوق قدرت کی خاطر سجایا گیا ہے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

محمدؐ کی گر رونمائی نہ ہوتی　　قسم ہے خدا کی خدائی نہ ہوتی

"سبحان اللہ، جزاک اللہ، مرحبا" کی آوازیں آ رہی تھیں، میری آنکھیں تو نہیں دل رو رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ ہماری پولیس کو یہ اسلام سکھایا جا رہا ہے۔ اسی شام کو ایک عزیز جو ملٹری کے ڈاکٹر ہیں تشریف لائے اور انھوں نے اپنے جلسے کی ایسی ہی کیفیت بیان کی۔ فرق یہ ہے کہ یہاں تقریر کرنے والے ایک افسر تھے اور وہاں ایک مولوی صاحب۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہماری فوج کو بھی اسی قسم کا اسلام سکھایا جاتا ہے۔ میرے ساتھ جو دیوبندی نوجوان تھے، انھوں نے میرے تعجب کو بھانپ کر بتایا کہ یہ تقریر جو آپ نے آج سنی ہے، کوئی نئی چیز نہیں۔ بریلوی مولوی صاحبان ہمیشہ اسی قسم کی تقریریں فرمایا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ اور اس ملک کے کروڑوں مسلمان اس قسم کے مواعظ کو سننا ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔

مذکورہ تقریر کے بعد مجھے موقع دیا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ "اس وقت ہم بہت سے محسوس مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں۔ ان مسائل کا حل ہمیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں تلاش کرنا ہے۔ آپ کی ذات مبارک بہت سی صفات کی جامع ہے اور ہر صفت ایک الگ نمونہ پیش کرتی ہے۔ آپ بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی ہیں، سوداگر بھی ہیں، معلم و مبلغ بھی ہیں، زاہد و عابد بھی ہیں اور سپہ سالار بھی ہیں، بے یار و مددگار بھی ہیں اور فاتح و ظفر مند بھی ہیں، باہمہ بھی اور بے ہمہ بھی۔ الغرض کسی قسم کا آدمی ہو وہ آپ کی سیرت پاک میں اپنے لئے نمونہ تلاش کر سکتا ہے۔ جو خوبیاں سابقہ انبیاء میں جزئی طور پر ملتی ہیں وہ سب آپ میں ایک ہی جگہ

---

[1] نقل مطابق اصل ہے۔ [2] اوپر کی عبارت میں کئی جگہ "درود پڑھو" آنا چاہئے تھا جو مجھے فراموش ہو گیا۔

جمع ہوگئی ہیں۔ کہنے والے نے ٹھیک کہا ہے:

حسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰؑ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مسیحؑ کی زندگی میں بادشاہی کا نمونہ نہیں، سلیمانؑ کے حالات میں درویشی نہیں، موسیٰؑ میں فتحمندی نہیں۔ وغیرہ ذالک۔ جس طرح قرآن میں تمام آسمانی کتابوں کا عطر آگیا ہے اور اس پر مزید بھی بہت کچھ ہے۔ اسی طرح آپؐ کی ذات میں تمام نبوتیں اکٹھی کردی گئی ہیں۔ اب کسی گذشتہ و آئندہ نبی کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کے بعد آج تک جو متنبی قسم کے لوگ ہوئے ہیں، ان کو تو غلامی کی ذلت سے نکلنا بھی نصیب نہیں ہوا بلکہ بعض تو غلامی و محکومی ہی کے مبلغ[1] تھے۔

ہمارا یہ اجلاس ایک خاص طبقے کے لوگوں کا اجتماع ہے۔ اس طبقے کے لئے آپ کی سیرت پاک سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس وقت دنیا میں بے شمار مذاہب ہیں۔ لیکن کثرت تین مذاہب کے پیروؤں کی ہے۔ بدھ۔ عیسائی اور مسلمان۔ ان میں کا ہر گروہ کروڑوں کی تعداد میں پھیلا ہوا ہے — مقدم الذکر دونوں مذہبوں کے بانی تارک، راہب اور درویش قسم کے بزرگ تھے۔ ان کے مشاغل و اعمال میں کوئی تنوع اور بوقلمونی نہیں۔ ہم کو ان سے ملائم اخلاق کا درس ملتا ہے اور بس — لیکن پیغمبر اسلامؐ کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک سپاہی کی حیثیت میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان کو آسمان وحی سے حکم پہنچتا ہے کہ "جنگ کر اس معاملے میں تو اپنی ذات کا ذمہ دار ہے"۔ جب آپ وردی پہن کر مسلح ہو جاتے ہیں تو آواز آتی ہے کہ "اپنے ایمان لانے والوں کو بھی جنگ کی ترغیب دے" (۸/۶۵) یعنی محمدؐ اور اصحابِ محمدؐ سب مسلح ہو جائیں۔ سب سپاہی بن جائیں — اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا دین ایک مقدس سپاہی سے شروع ہوا اور ہمارے سلفِ صالحین سپاہی ہی تھے۔ خدا کے سپاہی۔ دین کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے والے سپاہی۔ اگر وہ سپاہی نہ ہوتے تو یہ دین مکّہ کی گلیوں سے باہر نہ نکل سکتا۔ ہم جو یہاں بیٹھے ہیں، کوئی کیشو رام ہوتا اور کوئی گیکر سنگھ۔ یہ تلوار اور قرآن کی برکت ہے کہ ہم عبداللہ اور عبدالرحمٰن بنے بیٹھے ہیں۔ تلوار اور قرآن

این دو قوت حافظ یک دیگر اند کائنات زندگی را محورانند (اقبال)

سپاہیوں کو فخر کرنا چاہئے کہ ان کا پیغمبر اسلامؐ پہلا سپاہی تھا۔ اگر وہ تلوار اور قرآن کو ساتھ ساتھ رکھیں تو وہی اپنے پیغمبرؐ کے سچے پیرو ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ملکی دفاع کا ہے۔ ہماری دفاعی مساعی نہ حکومت پر احسان ہے نہ کسی اور پر۔ اسی سے ہمارے دین کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ اسی سے ہم اپنی آئندہ نسلوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں، اسی سے ہماری بہنوں، بیٹیوں اور بہوؤں کی آبرو بچ سکتی ہے۔ خدانخواستہ اگر ہم موجودہ آزادی کو مضم نہ کر سکے اور اپنی بداطواریوں سے نااہل ثابت ہوئے تو ہماری آئندہ نسلیں (اگر ہوئیں تو) ہم پر لعنت کریں گی کہ

ہمارے بڑوں کو ایک بڑا خطۂ زمین مل گیا تھا جس میں رہ کر وہ ہر طرح کی ترقی کر سکتے تھے لیکن وہ

---

[1] یہ آخری فقرے وقتِ تحریر اضافہ کر رہا ہوں۔

اپنی نالائقیوں کی وجہ سے اس کو سنبھال نہ سکے۔

خدا وہ دن نہ لائے کہ یہ منحوس الفاظ پورے ہو جائیں۔ میں آپ کے سامنے دست بستہ اسی قرآن کا واسطہ دیکر عرض کرتا ہوں جو میرے ہاتھ میں ہے کہ اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھالیں وہ ناہنجارانہ طور طریقے جو ہمیں غلامی کے زمانے سے ورثۃً ملے ہیں، انھیں ترک کر دیں۔ نیک عملی اور راست روی اختیار کریں۔ اسی میں ملک کا بچاؤ ہے اور اسی میں ہماری فلاح و نجات ہے۔"

میں یہ تقریر کر کے رخصت ہوا۔ میرے بعد پھر وہی نعت خوانی شروع ہو گئی

"حسینوں کی بانکی ادا ہیں محمدؐ گنہگار کے بخشوا ہیں محمدؐ"

یہ نقل بھی مطابق اصل ہے ـــ میں اسی وقت سے اس کرب میں مبتلا ہوں کہ میری قوم کا انجام کیا ہوگا۔ یہ زہر قاتل جو دین کے نام پر ہمیں پلایا جا رہا ہے۔ ہم اس سے اپنے آپ کو کس طرح بچا سکتے ہیں؟ اور جو شخص یہ زہر کا پیالہ پینے والوں کے لب سے جدا کرنا چاہتا ہے اس کو کافر بے دین، ملحد وغیرہ القاب و خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں عوام تو خیر عوام ہیں ملٹری اور پولیس تو ملک و حکومت کی بنیادیں ہیں۔ انھیں تو اس مہلک وعظ و تبلیغ سے بچایا جائے اور کوئی بھلے آدمی منتخب کر کے ان کی تعلیم دین کے لئے مقرر کئے جائیں اور اس قسم کے خرافاتی واعظوں کی زبانوں پر کم از کم سرکاری محکموں میں تالا لگایا جائے۔

میرے خیال میں اس زہرناکی کا پہلا ذمہ دار وہ شخص ہے جس نے غیر قرآنی روایات کو دین میں داخل کیا۔

دل نے کانوں سے سنی، دل سے زباں تک پہنچی بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

عرشی۔ لاہور

طلوعِ اسلام محترم عرشی صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں صرف ایک مجلسِ عید میلاد کی روئداد تحریر فرمائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عیدِ میلاد کی قریب قریب ہر مجلس میں یہی کچھ ہوتا ہے، جو انھوں نے بیان فرمایا ہے۔ اس میں نہ اوفیسز کی تخصیص ہے نہ مولوی صاحبان کی۔ نہ بریلوی کی نہ دیوبندی کی۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ عید میلاد النبیؐ کی (سالانہ) تقریب پر پورے پاکستان میں جسقدر "اہم" مجالس ہوتی ہیں، اگر ان کی روئداد یک جا شائع کر دی جائے تو غیر مسلموں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے یہی ایک مجموعہ کافی ہو سکتا ہے! یہ اس ذات گرامیؐ کی بعثتِ مقدسہ کی تقریب کے متعلق ہو رہا ہے جو تمام نوعِ انسان کو خوشگواریوں اور کامرانیوں کی راہ دکھانے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

اس باب میں، اس سال ایک اور اہم چیز کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے مسلمان اس تقریبِ عالیہ میں جو کچھ کرتے تھے اس کے متعلق پھر بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں ہیں۔ مسلمانوں کا سمجھدار طبقہ ان لغویات کو صحیح نہیں مانتا۔ لیکن اس سال بحمداللہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی طرف سے یہ تقریب مقدس، سرکاری طور پر منائی گئی ہے۔ اگر آپ

ان محافل کی روئداد پڑھیں جنھیں اب "سرکاری" ہونے کا بھی شرف حاصل ہو چکا ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا انداز بھی ان مجالس سے کچھ مختلف نہ تھا جنھیں عامیانہ مجالس کہا جاتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ غیر مسلم اقوام ان چیزوں کو دیکھکر ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہوں گی۔ ہمارے متعلق وہ کیا رائے قائم کرتی ہیں، اس کا بھی زیادہ افسوس نہیں۔ سب سے بڑا رنج تو یہ ہے کہ اقوام عالم، اُس ذاتِ اقدسؐ و اعظم کے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہوں گی جس کی بعثت کی تقریب اس طرح منائی جاتی ہے۔ اس سال عین اس تقریب سے متصل، اقوام متحدہ کی طرف سے منعقد کردہ "حقوق انسانیت کا دن" (Human Rights Day) منایا گیا۔ ہمیں اقوامِ عالم کو بتلانا یہ چاہیئے تھا کہ "حقوقِ انسانیت" کا دن منانا چاہتے ہو تو اس ذات گرامیؐ کی بعثت کا دن مناؤ جس نے انسانوں کو سب سے پہلے یہ تصور دیا کہ انسان کے بحیثیت انسان کیا حقوق ہوتے ہیں؟ لیکن دوسروں پر کیا گلہ جب ہماری اپنی حالت یہ ہے کہ ہم نوعِ انسان کے اس محسنِ اعظمؐ کے ظہور کی تقریب "درود پڑھ پڑھ کے" (بلکہ گا گا کر) مناتے رہتے ہیں اور "حقوقِ انسانیت" کے سلسلہ میں اقوام متحدہ کا متعین کردہ دن مناتے ہیں! اے کاش مسلمان کو کوئی بتائے کہ

تو قدرِ خویش ندانی! بہا ز تو گیرد
وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

تاریخِ رسالت (معارف القرآن جلد سوم)

رسول کریم صلعم سے پیشتر کے انبیائے کرامؑ کی دعواتِ انقلاب کا تذکرہ۔

قیمت پندرہ روپے

معراجِ انسانیت (معارف القرآن جلد چہارم)

سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلامؐ قرآن کے آئینے میں۔

قیمت بیس روپے

نوادرات۔ مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری۔

ضخامت چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

اے رحمۃ للعالمین ؐ

(طلوع اسلام کے حلقۂ قارئین میں سے ایک صاحبدل بزرگ شیخ محمد یعقوب صاحب نے اپنے سال حج کو روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پہلے خیال ظاہر فرمایا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر حاضری کے وقت ایک بالکل نیا سلام پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور مجھ سے فرمائش کی کہ ممکن ہو تو اس موضوع پر کوئی خاص نظم لکھ دوں۔ میں نے اس سعادت کو غنیمت جانا۔ کچھ عرصے سے ایک نعتیہ مستزاد زیر ترتیب تھا اسے مکمل کر کے ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ مطابق یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو عین اس وقت شیخ صاحب کے حوالے کیا جس رات ان کے ہوائی جہاز کی حجاز کو روانگی تھی۔ چلتے وقت انھوں نے ہدایت کر دی تھی کہ جب تک یہ سلام روضۂ پاک پر پڑھ نہ لیا جائے، شائع نہ کیا جائے۔ چنانچہ اب ان کے واپس تشریف لانے پر یہ نظم چند اشعار کے اضافے کے ساتھ ہدیۂ قارئین کی جاتی ہے۔ اسدؔ)

اے سب جمیلوں سے جمیل، اے سب حسینوں سے حسیں — اے رحمۃ للعالمین ؐ
اے وہ کہ تیری مثل فطرت کے تصور میں نہیں — اے رحمۃ للعالمین ؐ
آدم کو تو پہلے ہی دن، ابلیسِ سرکش کے سوا — سجدہ فرشتوں نے کیا
انسانیت نے تیرے قدموں پر جھکائی ہے جبیں — اے رحمۃ للعالمین ؐ
پہلوں کو تجھ پر فخر ہے، پچھلوں کو تجھ پر ناز ہے — تو مایۂ اعزاز ہے
اے اعتبارِ اولیں، اے افتخارِ آخریں — اے رحمۃ للعالمین ؐ
ہے اس سے ظاہر کس قدر تیری صداقت کا اثر — تیری امانت کا اثر
دشمن بھی دل سے مانتے تھے تجھ کو صادق اور امیں — اے رحمۃ للعالمین ؐ
تجھ کو حکیم لم یزل نے از رہِ لطف و عطا — وہ خرمنِ حکمت دیا
منکر بھی نادانستہ یا دانستہ جس کے خوشہ چیں — اے رحمۃ للعالمین ؐ
اہلِ جہاں محتاج ہیں تیرے ہی فیضِ عام کے — ممنون ہیں اسلام کے
ہے کون ایسا جو ترے دامن کے سائے میں نہیں — اے رحمۃ للعالمین ؐ
تیرے تکلم سے دلِ انساں کو پیغام سکوں — افزائشِ جذبِ دروں
تیرے تبسم سے غمِ دوراں کی تلخی انگبیں — اے رحمۃ للعالمین ؐ
ہاں گوئے نازاکشر بہ شانِ بے نیازی لے گئے — مردانِ غازی لے گئے
شاہوں سے بازی لے گئے تیرے غلام ادنیٰ ترین — اے رحمۃ للعالمین ؐ
ہر امتحاں کے وقت رکھ لیتا ہے اس کی آبرو — تیرے شہیدوں کا لہو
امت ہے تیری سرخرو، اے سبز گنبد کے مکیں — اے رحمۃ للعالمین ؐ
انسانیت پھر اپنے ہتھیاروں سے خود بسمل ہوئی — پھر زندگی مشکل ہوئی
قوموں میں پھر ابھرے ہیں جذباتِ عناد و بغض و کیں — اے رحمۃ للعالمین

یہ انقلاب دمبدم اور محوِ خوابِ اہلِ حرم — غافل عرب، غافل عجم
باطل کے ہنگاموں کا شور اور اہلِ حق خلوت گزیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
ملت جو بے ترتیب و بے تنظیم و بے شیرازہ ہے — غفلت کا یہ خمیازہ ہے
روز ایک زخمِ تازہ ہے ہر داغِ کہنہ کے قریں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
قصہ فلسطیں کا بھی ہے کشمیر کا بھی ذکر ہے — دونوں کی سب کو فکر ہے
ہے اس سے دنیا کے مسلمانوں کا دل اندوہ گیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
مسلم کو پہنچائیں زیاں غیروں میں یہ طاقت کہاں — ہو بھی تو یہ جرأت کہاں
اکثر بنے آزارِ جاں اپنے ہی مارِ آستیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
ایسے مسلماں بھی ہیں جو ایماں کے دعویدار ہیں — دیں سے مگر بیزار ہیں
اغیار کے تو یار ہیں اور دوستوں کے عیب چیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
ایسے مسلماں بھی ہیں جو گرویدۂ افرنگ ہیں — غیروں سے ہم آہنگ ہیں
اسلام کی تقدیر کا آتا نہیں ان کو یقیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
اچھا سمجھ کر اس میں ہو جاتے ہیں مسلم مشتغل — اتنے ہوئے ہیں سادہ دل
جس چیز کو ان کے لئے اچھا کہیں اعدائے دیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
ایسے ہی نادانوں کا رخ ہے مغربیت کی طرف — یا مزدکیت کی طرف
جو تیرے دیں کے حسنِ عالمگیر سے واقف نہیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
تیری نگاہِ زندگی پرور سے ہو کر بہرہ ور — بیگانگی ہو اس قدر
اشکِ ندامت سے ہے تر اہلِ نظر کی آستیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
بارے تری امت میں پھر آثار بیداری کے ہیں — انداز ہشیاری کے ہیں
جنبش سی ہے اک ساحلِ بربر سے تا اقصائے چیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
اک بار پھر امت تری آئے قدیمی شان پر — کر کے عمل قرآن پر
غالب ہو کل ادیان پر اک بار پھر دینِ مبیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
تیرے غلاموں کو یہ پاکستان کی نعمت ملی — برکت ہے تیرے نام کی
گہوارۂ اسلام بھی بن جائے اب یہ سرزمیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
نسبت تجھی سے ہے ہمیں حالت بری ہے یا بھلی — بس ہے سہارا آخری
عقبیٰ میں بھی دنیا میں بھی تیری شفاعت[1] کا یقیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ
ملت کی خدمت کے لئے بارے اسدؔ کو بھی ملے — لطفِ نگاہِ خاص سے
چشمِ جہاں بیں دل بصیر و حرفِ دل نشیں — اے رحمۃً للعالمیںؐ

اسدؔ ملتانی

---

[1] قرآن کی رو سے شفاعت کا کیا مفہوم ہے اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں کبھی تفصیل سے لکھا جائیگا۔ عام مروجہ مفہوم تو بہرحال قرآنی نہیں۔ طلوعِ اسلام

THE ANGLO-THAI CORPORATION LTD.

(Incorporated in England)

(EWART RYRIE BRANCH)

Importers, Exporters & General Merchants

Nadir House, McLeod Road

KARACHI

BRANCHES:—

BANGKOK.

SINGAPORE.

BOMBAY

KUALA LUMPUR.

PENANG.

Agents for:—

Howards & Sons Ltd., Ilford, London —
QUININE SALTS & FINE CHEMICALS.

Stafford Allen & Sons Ltd., London.—
MANAUFACTURING CHEMICALS.

J. R. Geigy, Basle.—*Insecticides.*—
DYES & PHARMACEUTICALS.

Eli Lilly International Corporation, Indianapolis (U.S.A.).—
PHARMACEUTICALS.

H. Bronnley & Co. Ltd., London.—
TOILET REQUISITES.

London Varnish & Enamel Co. Ltd., London.—
PAINTS & VARNISHES Etc., Etc.

سول ایجنٹ:- مسلم اینڈ کمپنی جوڑیا بازار کراچی ۲

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ وہ تنہا ادارہ ہے، جو گراموفون ریکارڈ کے ذریعہ سے نئی زبان سکھاتا ہے؛

زبان وہ سیکھئے

جو اہلِ زبان بولتے ہیں

نصابی کتابوں سے آپ کوئی غیر ملکی زبان" درست کا صحیح طریقہ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کیلئے ضروری ہے۔ آواز کا وہ انداز اور اتار چڑھاؤ اور کلام کا وہ لب ولہجہ جو عموماً روزمرہ کی بول چال میں اہلِ زبان کام میں لاتے ہیں "لنگوافون" سے یہ چیزیں بہت جلد پوری پوری طرح اور بغیر محنت و کوشش کے ذہن نشین ہو جائیں گی۔

کوئی زبان سیکھنے کے لئے عموماً جتنا وقت درکار ہوتا ہے لنگوافون اس کی نصف مدت میں آپ کو وہ زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے قابل بنا دیتا ہے، اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار کام یعنی بولی سنکر سمجھ لینے کی مہارت پیدا کر دیتا ہے،

اس طریقہ تعلیم میں درس و تدریس کے منجمد قواعد و ضوابط نہیں ہیں بلکہ شروع ہی سے آپ کو روزمرہ بول چال کے ایسے ماحول میں رکھ دیا جاتا ہے جو ٹھنڈی سڑکوں، قہوہ خانوں یا سیرگاہوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کیجئے اور چند ماہ میں آپ اپنی دل پسند زبان میں آزادانہ اظہارِ خیال کر لینے پر قادر ہو جائینگے، زبان سیکھنے کیلئے اس اچھوتے اور جدید طریقے کے متعلق پوری معلومات حاصل کیجئے، مندرجہ ذیل کوپن ڈاک میں ڈال دیجئے۔ فوراً تفصیلی جواب دیا جائیگا۔

زبان سیکھنے کیلئے لنگوافون

اردو	انگریزی	فارسی ....
عربی	بنگالی	ہندوستانی ....
فرانسیسی	روسی	چینی ....
اسپینش	اطالوی	ڈچ ....
سویڈش	نارویجین	فنش ....
زیچ	پولش	لاطینی ....
یونانی	الفنک	ملائے ....
ہوسا	آئس لینڈک	سواحلی ....
جرمن	ترکی	پرتگالی ....

اپنی پسند کردہ زبان کے آگے چلیپا (×) بنا دیجئے اور نیچے غرض یا وجہ لکھئے

زبان سیکھنے کی وجہ یا غرض ....

نام ....

پتہ ....

....

جنرل سکریٹری صاحب

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ متصل گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ کراچی۔

براہ مہربانی اپنی تفصیلی کتاب جسمیں لنگوافون اور ہفتہ بھر کی مفت آزمائش کے متعلق وضاحت درج ہے، بھیج دیجئے۔

میرے پاس گراموفون باجہ ہے جو ہے / نہیں ہے

پام روز

ٹائیلٹ سوپ آپ کے جسم کو ہر قسم کے میل سے بالکل صاف کردے گا اور آپ کی جلد کو ملائم رکھے گا۔

نہانے کے لئے ہمیشہ اس کا استعمال کیجئے

اسپیشل کیمل

کپڑے دھونے کا نہایت اعلیٰ صابن ہے

ہر قسم کے کپڑے پورے اطمینان سے دھوئیے۔ اسپیشل کیمل ان کو مصفّا اور مجلّا بھی رکھے گا اور دیرپا بھی بنائے گا۔

پام روز ــــ اور ــــ اسپیشل کیمل

خریدنے میں آپ کا ذاتی فائدہ بھی ہے اور قومی مفاد بھی۔

ہمیشہ پاکستانی مصنوعات کی سرپرستی کیجئے

کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز۔ کراچی

Regd. No. S. 1089.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for:-

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS

BY PRODUCING

Highly Vitaminised & Nutritive Cooking Oil

High Class Washing Soap which Cleanses Clothes 'Milky White'

BENGAL OIL MILLS LTD

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams : "BENGALI"

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone | Office : 3338
Mills : 2006

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at Adbi Press, Robeson Road, Karachi, published by Khurshid Alam & issued from Tolu-e-Islam Office, Robeson Road, Karachi.